دو اسلام

دو اسلام

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

شیخ غلام علی اینڈ سنز - پبلشرز
لاہور - حیدر آباد - کراچی

طابع — شیخ نیاز احمد

مطبع — علمی پرنٹنگ پریس لاہور

اشاعت ہفتم — ۱۹۶۲ء

قیمت

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ ادبی مارکیٹ۔ چوک انارکلی۔ لاہور

فہرس

حرفِ اوّل

یہ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے

میں قبلہ والد صاحب کے ہمراہ امرتسر گیا۔ میں ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا، جہاں نہ بلند عمارات، نہ مصفّا سڑکیں، نہ کاریں، نہ بجلی کے قمقمے اور نہ اُس وضع کی دکانیں۔ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ لاکھوں کے سامان سے سجی ہوئی دکانیں۔ اور بورڈ پر کہیں رام بھیجا سنت رام لکھا ہے، کہیں دُنی چند اگر وال، کہیں سنت سنگھ سیل اور کہیں شادی لال فقیر چند۔ ہال بازار کے اس سرے سے اُس سرے تک کسی مسلمان کی کوئی دکان نظر نہ آئی۔ ہاں مسلمان ضرور نظر آئے۔ کوئی بوجھ اُٹھا رہا تھا۔ کوئی گدھے لاد رہا تھا، کوئی تانگہ سے بیل گاڑی پہ ہندو کا سامان لاد رہا تھا۔ کوئی کسی ٹال پہ لکڑیاں چیر رہا تھا، اور کوئی بھیک مانگ رہا تھا۔ غیر مسلم کاروں اور فٹنوں پہ جا رہے تھے اور مسلمان اڑھائی من بوجھ کے نیچے دبا ہُوا مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا۔ ہندوؤں کے چہروں پر رونق بشاشت اور چمک تھی اور مسلمان کا چہرہ فاقہ، مشقت، فکر اور جھڑکیوں کی وجہ سے افسردہ و مسخ شدہ۔

مَیں نے والد صاحب سے پوچھا،

"کیا مسلمان ہر جگہ اسی طرح کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟

والد صاحب: ہاں!

میں :- اللہ نے مسلمان کو بھی ہندو کی طرح دو ہاتھ ، دو پاؤں اور ایک سر عطا کیا ہے ، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہندو تو زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے اور مسلمان ہر جگہ حیوان سے بدتر زندگی بسر کر رہا ہے ؟

والدصاحب :- یہ دنیا مردار سے زیادہ نجس ہے اور اس کے متلاشی کتوں سے زیادہ ناپاک ۔ اللہ نے یہ مُردار ہندوؤں کے حوالے کر دیا ہے اور جنّت ہمیں دے دی ہے ۔ کہو کون فائدے میں رہا ؟ ہم یا وہ ۔

مَیں :- اگر دنیا واقعی مُردار ہے ، تو آپ تجارت کیوں کرتے ہیں ، اور مالِ تجارت خریدنے کے لیے امرت سر تک کیوں آئے ؟ ایک طرف دنیوی سازو سامان خرید کر منافع کمانا ، اور دوسری طرف اسے مردار قرار دینا عجیب قسم کی منطق ہے ۔

والدصاحب :- بیٹا ! بزرگوں سے بحث کرنا سعادت مندی نہیں ۔ جو کچھ مَیں نے تمہیں بتایا ہے ، وہ ایک حدیث کا ترجمہ ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ۔

اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَّ طُلَّابُھَا کِلَابٌ ۔ یہ دنیا ایک مردار ہے ، اور اُس کے متلاشی کُتّے ۔

حدیث کا نام سُن کر میں ڈر گیا اور بحث بند کر دی ۔ سفر سے واپس آکر میں نے گاؤں کے مُلّا سے اپنے شبہات کا اظہار کیا ۔ اُس نے بھی وہی جواب دیا ۔ میرے دل میں اس معمّے کو حل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی ۔ لیکن

میرے قلب و نظر پہ تقلید کے پہرے بیٹھے ہوتے تھے۔ علم کم تھا۔ اور فہم محدود، اِس لیے معاملہ زیادہ اُلجھتا گیا۔
میں مسلسل چودہ برس تک حصولِ علم کے لیے مختلف علماء و صوفیا کے ہاں رہا۔ درسِ نظامی کی تکمیل کی۔ سینکڑوں واعظین کے وعظ سُنے۔ بیسیوں دینی کتابیں پڑھیں، اور بالآخر مجھے یقین ہوگیا کہ اسلام رائج کا حاصل یہ ہے:

(۱) فرائض خمسہ یعنی توحید کا اقرار اور صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج کی بجا آوری۔
(۲) اذان کے بعد ادب سے کلمہ شریف پڑھنا۔
(۳) مختلف رسوم مثلاً جمعرات، چہلم، گیارہویں وغیرہ کو باقاعدگی سے ادا کرنا۔
(۴) قرآن کی عبارت پڑھنا۔
(۵) اللہ کے ذکر کو سب سے بڑا عمل سمجھنا۔
(۶) قرآن اور درود کے ختم کرانا۔
(۷) اُچھل اُچھل کر ہُو حق کا وِرد کرنا۔
(۸) نجات کے لیے کسی مرشد کی بیعت کرنا۔
(۹) مُردوں سے مرادیں مانگنا۔
(۱۰) مزاروں پر سجدے کرنا۔
(۱۱) غلیظ لباس کو پیغمبری لباس سمجھنا۔

(۱۲) سڑکوں اور بازاروں میں سب کے سامنے ڈھیلا کرنا۔
(۱۳) تعویذوں اور منتروں کو مشکل کشا سمجھنا۔
(۱۴) آنحضرت صلعم کو عالم الغیب، نیز حاضر و ناظر قرار دینا۔
(۱۵) کسی بیماری یا مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے مولوی جی کی ضیافت کرنا۔
(۱۶) گناہ بخشوانے کے لیے قوالی سُننا۔
(۱۷) ہر غیر مسلم کو ناپاک و نجس سمجھنا۔
(۱۸) امام ابو حنیفہؒ کی فقہ پر ایمان لانا۔
(۱۹) صحاح ستّہ کو وحی سمجھنا
(۲۰) تمام علوم جدیدہ، مثلاً طبیعیات، ریاضیات، اقتصادیات، تعمیرات وغیرہ کو کفر خیال کرنا۔
(۲۱) غور و فکر اور اجتہاد و استنباط کو گناہ قرار دینا۔
(۲۲) صرف کلمہ پڑھ کر بہشت میں پہنچ جانا۔
(۲۳) ہر مشکل کا علاج عمل اور محنت سے نہیں، بلکہ دعاؤں سے کرنا مثلاً سوتے وقت یہ دعا پڑھو۔ اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَ اَحْیٰی خواب میں خواجہ خضر کی زیارت ہوگی۔ جاگو تو بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ کا وِرد کرو، حوریں تمہارا منہ چاٹیں گی سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ کا جملہ منہ سے نکالو تو ساری زندگی کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ وضو میں منہ دھوتے وقت جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ

کا وِرد کرو تو تمہیں حضرتِ آدم علیہ السّلام کے دس لاکھ حج کا ثواب ملے گا۔ نماز کے بعد لاحول ولا قوۃ پڑھو تو سات آسمانوں اور سات زمینوں جتنا ثواب حاصل ہوگا ۔ وغیرہ وغیرہ

جب علماے کرام کے فیض سے میں تعلیماتِ اسلامی پر پوری طرح حاوی ہوگیا تو یہ حقیقت بھی مجھ پہ واضح ہوگئی، کہ خدا ہمارا، رسول ہمارا، فرشتے ہمارے، جنّت ہماری، حوریں ہماری، زمین ہماری اور آسمان ہمارا۔ الغرض سب کچھ کے مالک ہم ہیں، اور باقی قومیں اِس دنیا میں جھک مارنے کے لیے آئی ہیں۔ ان کی دولت، عیش اور تنعّم محض چند روزہ ہے۔ وہ بہت جلد جہنم کے پست ترین طبقے میں اوندھے پھینک دیے جائیں گے، اور ہم کمخواب وزربفت کے سوٹ پہن کر سرمدی بہاروں میں حوروں کے ساتھ مزے لوٹیں گے۔

زمانہ گزرتا گیا۔ انگریزی پڑھنے کے بعد علومِ جدیدہ کا مطالعہ کیا۔ قلب ونظر میں وسعت پیدا ہوئی۔ اقوام وملل کی تاریخ پڑھی تو مجھے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی ایک سو اٹھائیس سلطنتیں مٹ چکی ہیں۔ حیرت ہوئی کہ جب اللہ ہمارا اور صرف ہمارا تھا، تو اُس نے خلافتِ عباسیہ کا وارث ہلاکو جیسے کافر کو کیوں بنایا۔ ہسپانیہ کے اسلامی تخت پہ فرڈیناں کو کیوں بٹھایا۔ مغلیہ کا تاج الزبتھ کے سر پہ کیوں رکھ دیا۔ بلغاریہ، ہنگری، رومانیہ

سرویہ ، پولینڈ ، کریمیا ، یوکرائن ، یونان اور بلغراد سے ہمارے آثار کیوں مٹا دیے ۔ فرانس سے بیک بینی ودو گوش ہمیں کیوں نکالا ۔ ٹیونس ، مراکو ، الجزائر اور لیبیا سے ہمیں کیوں رخصت کیا ؟

میں رفع حیرت کے لیے مختلف علما کے ہاں گیا ۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی ۔ میں نے اس مسئلے پر پانچ سات برس تک غور و فکر کیا ۔ لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا ۔ بدقسمتی سے یہ وہ دور تھا جب میں اسلام سے سخت دل برداشتہ ہو چکا تھا ، اور سالہا سال سے تلاوتِ کلام اللہ ترک کر رکھی تھی ۔

ایک دن سحر کو بیدار ہوا ۔ اوپر طاق میں قرآن شریف رکھا تھا شغلاً اٹھایا ، کھولا ، اور پہلی آیت جو سامنے آئی وہ یہ تھی ۔

اَوَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ	کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم ان سے
مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِی	پہلے کتنی اقوام کو تباہ کر چکے ہیں ۔ ہم نے
الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ	انھیں وہ شان و شوکت عطا کی تھی ۔ جو
وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ	تمہیں نصیب نہیں ہوئی ۔ ہم
مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ	ان کے کھیتوں پر چھما چھم بارشیں
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ	برساتے تھے ۔ اور ان کے باغات
بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا	میں شفاف پانی کی نہریں بہتی تھیں ۔

مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ۔ لیکن جب انہوں نے ہماری راہیں چھوڑ دیں تو ہم نے انہیں تباہ کر دیا اور اُن کا وارث کسی اور قوم کو بنا دیا۔

میری آنکھیں کھُل گئیں ۔ اندھی تقلید کی وہ تاریک گھٹائیں جو ذہنی ماحول پر محیط تھیں یک بیک چھٹنے لگیں ۔ اور اللہ کی سنتِ جاریہ کے تمام گوشے بے حجاب ہونے لگے ۔میں نے قرآن میں جا بجا یہ لکھا ہوا دیکھا کہ یہ دنیا دارالعمل ہے ۔یہاں صرف عمل سے بیڑے پار ہوتے ہیں ہر عمل کی جزا و سزا مقرر ہے ۔جسے نہ کوئی دُعا ٹال سکتی ہے اور نہ دوا۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى یہاں صرف اپنی کوششیں ہی کام آتی ہیں۔

(قرآن)

میں سارا قرآن پڑھ گیا ، اور کہیں بھی محض دعا یا تعویذ کا کوئی صلہ نہ دیکھا ۔کہیں بھی زبانی خوشامد کا اجر زمردیں محلات ۔ حوروں اور حجروں کی شکل میں نہ پایا ۔ یہاں میرے کانوں نے صرف تلواروں کی جھنکار سنی ۔ اور میری آنکھوں نے غازیوں کے وہ جھرمٹ دیکھے جو شہادت کی لازوال دولت حاصل کرنے کے لیے جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود رہے تھے ۔ وہ دیوانے دیکھے جو عزم و ہمت کا عَلَم ہاتھ میں لیے معائیِ حیات کی طرف باندازِ طوفان بڑھ رہے تھے ۔ اور وہ پروانے دیکھے جو کسی کے جمالِ جہاں افروز پہ رہ رہ کے قربان ہو رہے تھے ۔
میں نے سوچا کہ حدیث و قرآن کی بتائی ہوئی راہوں میں اتنا

فرق کیوں ہے - احادیث کی تاریخ پڑھی تو منکشف ہوا کہ کہیں تو اعدائے اسلام نے توہینِ اسلام کے لیے، اور کہیں ہمارے ملّا نے قرآن کے تیغ و سناں والے اسلام سے بچنے کی خاطر تقریباً چودہ لاکھ احادیث وضع کر رکھی ہیں - جہاں ایک ایک دعا کا صلہ لاکھ لاکھ محل دیا ہوا ہے -

اس انکشاف کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ مسلمان ہر جگہ محض اسی لیے ذلیل ہو رہا ہے، کہ اس نے قرآن کے عمل، محنت اور ہیبت والے اسلام کو ترک کر رکھا ہے - وہ اوراد و ادعیہ کے نشے میں مست ہے اور اس کی زندگی کا تمام تر سرمایہ چند دعائیں اور چند تعویذ ہیں اور بس۔

اور ساتھ ہی یقین ہو گیا کہ **اِسلام دو** ہیں - ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے اور دوسرا وضعی حدیث کا اسلام جس کی تبلیغ پر ہمارے اسّی لاکھ مُلّا قلم اور پھیپھڑوں کا سارا زور صرف کر رہے ہیں -

آئیے! ذرا اس "حدیثی اسلام" پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں -

برق

کیمبل پور - ۲۵، ستمبر ۱۹۴۹ء

تعارف

میں نے زیرِ نظر کتاب "دو اسلام" کے کچھ حصے غور سے اور کچھ قلّتِ فرصت کے سبب سرسری نظر سے دیکھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، اس کے پڑھنے والے اختلافِ میلان کی وجہ سے اس سے مختلف قسم کے تین اثرات حاصل کریں گے۔

۱۔ نوخیز طبقہ جو موجودہ روایتی اسلام سے صد فی صد بیزار ہو چکا ہے۔ وہ اسے اپنے دل کی آواز سمجھے گا اور مصنّف کے ساتھ چل پڑے گا، جہاں جہاں وہ لے جائے۔

۲۔ دوسرا متین و سنجیدہ گروہ، مصنّف کی روح سے ہم آہنگ ہو جائے گا۔ لیکن اس کے تند و تیز لہجے کی مخالفت کرے گا۔

۳۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو ابھی ملائیت اور خانقاہیت کے زیرِ اثر ہیں۔ ان کی چیخیں نکل جائیں گی، وہ چلائیں گے۔ فریاد مچائیں گے، آسمان سر پہ اٹھا لیں گے۔

دیکھنا، لینا، پکڑنا، دوڑنا، جانے نہ پائے
لے چلا میری شکیبائی وہ کافر بے حجاب (طغرائی مرحوم)

مسجد و خانقاہ نے ایک وقت تک دنیا کو روشنی بخشی، روحانیت پھیلائی، اخلاق و دیانت کا درس دیا۔ لیکن غیر اسلامی دنیا کو اسلام کی یہ سطوت و عظمت ایک آنکھ نہ بھائی۔ اس نے داخلی اور خارجی ہر ہتھیار

سے مسلح ہو کر اِس "جانِ عالم" کو شکست دینے کی ٹھان لی۔ پادریوں نے متعصّبانہ حملے کیے۔ مستشرقین نے زہر آمیز شربت تیار کیے۔ ویدک دھرم کے پجاریوں نے بھی ان کی پیروی کی۔ مغربی حکومتوں نے آزاد مسلم علاقوں کو محکوم اور محکوموں کو محکوم تر بنائے رکھنے کے لیے عجیب و غریب حیلے ایجاد کیے۔ بیرونی دباؤ کے ساتھ ساتھ ملّت میں اندرونی انتشار و اضطراب بددلی اور بے دینی پھیلانے کی منظم سازشیں کیں۔ اپنی سامراجی ڈپلومیسی کی تکمیل کے لیے بڑے بڑے مُلّا د پیر خریدے۔ مسیح و مہدی کھڑے کیے۔ مذہب کا احترام کرنے والوں کو ان مذہب فروشوں کے ذریعے جکڑا، اور نئی نسل کو اپاہج بنانے کے لیے اخلاق و دیانت سے خالی ایک ملحدانہ نظامِ تعلیم تجویز کیا۔ وہ مسلمان جس کے نعرۂ تکبیر سے مغرب کی ماؤں کے حمل ساقط ہو جاتے تھے، اس کو گرفتار کرنے کے لیے ہر طرف شکاری بٹھا دیے۔ اب وہ مسجد میں جاتے یا خانقاہ میں، کالج میں گھومے یا یونیورسٹی میں، محمد ﷺ کا جلال کہیں نہیں، صدیق و فاروق کی ہیبت کا خاتمہ ہے — ابلیس کے بیٹے مختلف لباسوں میں جلوہ گر ہیں۔ کہیں مفتی اور کہیں مرشد بن کر، کہیں پروفیسر اور کہیں لکچرار کی شکل میں۔

آخر غیرتِ سماوی اپنے زمینی بچّوں کی اِس زبوں حالی کو کب تک برداشت کرتی۔ شیطانوں کی باگیں کب تک ڈھیلی رہتیں۔ وہی جماعت جو تخریبِ اسلام کے لیے تیار کی جا رہی تھی، اسی میں سے کچھ لوگ

نکلے ۔ اِن کو آفتابِ اسلام کی کرنیں نظر آئیں ۔ اُنھوں نے اپنے
پاؤں سے روایتی اسلام کی بیڑیاں توڑ ڈالیں ۔ ان نوخیزوں کے لیے
زمین تیار کرنے والے وہ لوگ تھے ، جو ؏
نے ابلہ مسجد تھے ، نہ تہذیب کے فرزند

فرنگی فتنہ کو سب سے پہلے سیّد جمال الدین افغانی نے بھانپا ، اور عالم
آشکار کیا ۔ اُنہوں نے سرزمین فرنگ میں بیٹھ کر فرنگی کی شیطانی سیاست
کا غائر مطالعہ کیا ، اور اسلامی ممالک کے ہر گوشے میں پہنچ کر اپنے دل کی
آگ سے مسلمانوں کے جمود کو پگھلانے کی کوشش کی ۔ مصر میں مفتی محمد
عبدہٗ اور اُن کی جماعت سیّد افغانی سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ۔
ہندوستان میں سرسیّد کی پارٹی ۔ مولوی چراغ علی ، نواب محسن الملک ،
نواب وقار الملک ، خواجہ حالی ، مولانا شبلی وغیرھم نے اپنے طرز
میں اپنی استعداد کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح ، اور اسلام کی
اشاعت میں حصّہ لیا ۔ مُلّائی حلقوں سے ان کی شدید مخالفت کی گئی ۔
لیکن جو بیج پڑ چکا تھا ، اُسے بار ور ہونا ضروری تھا ۔ مشیّت
کو یہی منظور تھا ۔ انگریز کی مُسلم کش کوششیں تیز تر ہوتی گئیں ۔ لیکن
وہ جو فرعون کو مٹانے کے لیے فرعون ہی کے گھر میں موسےٰ کو
پروان چڑھا سکتا ہے ۔ اس کے سامنے یہ حکومتیں اور انکی چالاکیاں
کیا حقیقت رکھتی ہیں ۔ اُس نے انہی غارت گرِ اسلام کالجوں اور
یونیورسٹیوں سے وہ انسان تیار کر دیئے جن کے متعلق بالکل بجا طور

پر کہا جا سکتا ہے ع

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اکبرالہ آبادی نے اپنے اشعار میں ٹھیٹھ اسلام پیش کیا اور نہایت ہی پیارے اور دلکش حربوں سے فرنگی تسلط کا مقابلہ کیا۔ اقبال نے اسلام کی ہیجان انگیز روح اور معصوم و مقدس فطرت کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔ ان بزرگوں نے قوم کی فکری صلاحیتوں کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ لیکن عمل کی دنیا ابھی آگے تھی۔ اس کی تکمیل و احیاء کے لیے بھی مسجد و خانقاہ کی بانجھ فضا کو چھوڑ کر مشیت ایزدی نے مکتب فرنگ ہی سے کام لیا اور اپنی معجزہ نمائی کا حیرت انگیز ثبوت پیش کیا۔ قائد اعظم محمد علی جناحؒ جس کے رگ و ریشے میں انگریزیت کوٹ کوٹ کر بھری جا چکی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس مظلوم و محکوم قوم کو بیک وقت دو زبردست دشمنوں (ہندو اور انگریز) کے مظالم سے نجات دلانے کا کام اس سے لیا جائیگا؟ اس نے اسلام کے نام پر قرآنی قانون کو نافذ کرنے کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا۔ پاکستان جو اقبال کے دماغ سے نکلا تھا، جناح کے ہاتھوں مکمل ہوا۔

اب اسی اقبال و جناح کی مراد و مدعا کے مطابق ضرورت ہے اس میں اسلام کو رائج کرنے کی۔ قرآن کو بلند کرنے کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کونسا اسلام رائج کیا جائے؟ کس قرآن کو بلند کیا جائے؟ آپ حیران ہوں گے کہ اسلام تو ایک ہے اور قرآن بھی ایک۔ پھر "کون سا" کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس سوال کا مفصل جواب تو اس کتاب

میں دیا گیا ہے ۔ یہاں اختصاراً سمجھ لیجئے کہ ہمارے ہر فرقے کا اسلامؒ قرآن الگ ہے ۔ ایک اسلام و قرآن تو وہ ہے جو ۱۴ لاکھ حدیثوں کے بوجھ تلے دبا کراہ رہا ہے ۔ دوسرا وہ ہے جو مختلف فقہی سکولوں کے زنغے میں پھنسا ہوا اپنے نکلنے کے لیے فریاد بھی نہیں کر سکتا ۔ اور ایک تیسرا اسلام ہے جو حضرات اہل بیت کرام کے لکڑی اور کاغذ کے تعزیوں کے ساتھ بندھا ہوا کوچہ و بازار میں سالانہ گردش کرتا نظر آتا ہے ۔ ایک چوتھا اسلام وہ ہے جو استخواں فروش مجاوروں اور پیرزادوں کے حلقے میں ہو حق کے نعرے لگانے اور حال و قال کی بزم آرائی کے لیے مجبور ہے ۔ ان کے علاوہ ایک اور اسلام بھی ہے جس کے بطن سے نئی نئی نبوتیں اور خلافتیں جنم لیتی ہیں ۔ کہاں تک گناؤں ۔ مدت ہوئی " مذاہب اسلام " کے نام سے حیدرآباد کی چھپی ہوئی ایک کتاب دیکھی تھی ۔ جو کم و بیش ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی ۔ اس میں عجیب و غریب قسم کے بے شمار اسلام بتائے گئے ہیں ۔ اس کے آخری صفحات سے معلوم ہوتا تھا کہ سماوی نبوت کے ختم ہو جانے کے باوجود خانہ ساز نبوتوں اور اسلاموں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا ۔

اب پاکستان میں جو اسلامی قانون رائج ہو تو وہ کس اسلام کے مطابق ہو ؟ — یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے ، جو ہمارے واضعین قانون کو پریشان کیے ہوئے ہے ۔

یہ " کثرت اسلام ہا " ایک عالمگیر مرض ہے ، جس میں تمام مسلمانان

عالم مبتلا ہیں اور ہر خطۂ ارض میں ہماری پستی و ذلت کا یہی واحد سبب ہے۔ دفعیۂ مرض کے لیے سب سے پہلے اسبابِ مرض تلاش کیے جاتے ہیں۔ پھر علامات اور پھر علاج تجویز کیا جاتا ہے۔ ہمارے پیکرِ ملی کے مریض ہونے میں قطعاً شبہ نہیں۔ ہم یقیناً وہ نہیں ہیں جو ہمیں قرآن بنانا چاہتا ہے۔ پھر یہ کیوں ہے ؟ اتنے بے شمار اسلام کہاں سے آگئے۔ یقیناً محمد رسول اللہؐ نے ان سب کی طرف دعوت نہیں دی تھی۔ ان کے پاس بالاتفاق ایک ہی اسلام تھا۔ یہ سوال بیحد اہم ہے۔ اس پر ہماری موت و حیات کا انحصار ہے۔ اگر ہم اس کا جواب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہماری قومی کشتی یقیناً ساحلِ نجات سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔

خوش قسمتی سے اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے آج ہمیں پہلا قدم اُٹھانے کی زحمت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس وقت انگریز کی بندھنیں ہمارے اعضاً و اعصاب پر مضبوط ہو رہی تھیں اُسی وقت کچھ لوگ اس مشکل کا حل تلاش کرنے میں منہمک تھے۔ قریب قریب ایک ہی وقت میں مختلف حلقوں سے ایک ہی قسم کی آواز اٹھی۔ یہ ایک توارد تھا جو تصرفِ الٰہی سے وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ آج سے ۹۵ سال پہلے اسی شہر لاہور سے ایک آواز بلند ہوئی کہ اسلام وہ نہیں جو رائج ہے بلکہ اسلام پورے کا پورا قرآن ـــــ تنہا قرآن کے اندر موجود ہے۔ یہ ابتدائی قدم تھا بنیادی صداقت کی طرف، لیکن اس میں لڑکھراہٹ تھی۔

لغزشیں تھیں۔ اس کا دعوےٰ صحیح، دلائل صحیح، لیکن جو اسلام اِس کے
داعیوںؐ نے پیش کیا وہ بھی مروّجہ اسلاموں ہی کی طرح ایک فرقہ بندانہ
کوشش تھی جو پنپ نہ سکی۔ لیکن فضاء میں ایک عظیم گونج چھوڑ گئی۔
طبائع میں تجسس پیدا ہو گیا۔ لگ بھگ اسی زمانہ میں عظیم آباد پٹنہ
میں شمس العلماء مولانا محبّ الحق عظیم آبادی نے ایک سلسلۂ تصانیف
شروع کیا، جس کی تکمیل شرعۃ الحق، بلاغ الحق نام کی دو کتابوں پر ہوئی جن
میں پوری سنجیدگی اور عبور تحریر کے ساتھ ثابت کیا کہ مسلمانوں کی عالمگیر
بربادیوں کی ذمہ دار وہ متضاد حدیثیں ہیں، جن پر ہر فرقہ ایک دوسرے
سے اُلجھنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ اور کامل دین صرف قرآن میں
ہے۔ یہی نعرہ دہلی جامعہ ملیہ سے حضرت مولینا حافظ محمد اسلم مدظلہ جیراجپوری
نے بلند کیا۔ آپ کا لہجہ حد درجہ متین و مدلل ہے۔ بہار ہی کے ایک
دوسرے بزرگ علامہ تمنا عمادی مدظلہ بھی اسی میدان کے شہسوار ہیں۔
اس متبرک صف میں صرف آپ ہی ہیں جو باوجود پیرانہ سالی کے اب تک
خدمتِ قرآن کر رہے ہیں۔ پنجاب کے تجارتی شہر امرتسر مرحوم میں یہ کام
اللہ تعالیٰ نے خواجہ احمد الدینؒ اور ان کے مخلص رفقاء سے لیا۔ مولانا
اسلم کا لگایا ہوا بیج ماہنامہ "طلوعِ اسلام" کی شکل کراچی میں پھل پھول

لے داعی اوّل مولوی عبداللہ چکڑالوی مرحوم کے نام سے مشہور ہیں۔

لے مولانا بفضلِ خدا اس وقت ۹۲ سال کی عمر میں ہیں اور کراچی میں موجود ہیں۔ (دسمبر ۱۹۵۰ء)

رہا ہے۔ اور خواجہ احمدالدین مرحوم کی روح جریدہ "البیان" لاہور میں کام کر رہی ہے۔ یہ وہی "البیان" ہے جس نے "دو اسلام" کے مصنف کی حیرت انگیز تبلیغی تصنیف "دو قرآن" کو مسلسل قوم و ملک کے سامنے پیش کیا۔

پاکستان بننے سے بہت پہلے کارسازِ غیب نے اِن بزرگوں کے ذریعہ یہ بات واضح کر دی کہ ہمارے بے شمار اِسلاموں کا منبع ہماری فرقہ بندیوں کی وجہ، ہماری نسلی تباہیوں اور بربادیوں کا واحد سبب وہ بے شمار متضاد و متخالف حدیثیں ہیں، جن سے ہر فرقہ اپنے مطلب کی بات نکال لیتا ہے۔ مختلف فقہی حلقوں کی حدیثیں الگ۔ شیعوں کی حدیثیں الگ۔ صوفیوں کی حدیثیں الگ۔ اہلِ حدیث کہلانے والوں کا ذخیرہ الگ۔ نئے نئے مدعیانِ مسیحیت و مہدیت کا دفتر جدا۔ اسمٰعیلیوں اور باطنیوں کا سرمایہ سب سے انوکھا بعزض کیا ہے جو اس مداری کی پٹاری میں نہیں۔
قائدِ اعظم کی زبان سے پاکستان کے آئین کے متعلق "قرآن" کے سوا کبھی کوئی لفظ نہیں نکلا۔ میں سمجھتا ہوں یہ سب تصرفِ الٰہی کے تحت ہوا۔ ورنہ کہاں انگریزی ماحول کا پروردہ جناح اور کہاں قرآن کہاں حکمائے فرنگ کا شاگرد اقبال اور کہاں ریگ زارِ حجاز کا عشق ــــ

"دو قرآن" اور "دو اسلام" کا مصنف بھی مے کدۂ فرنگ کے خراباتیوں سے ہے، جس سے مشیّتِ خداوندی اپنا کام لے رہی ہے۔

اس نے " دو قرآن " لکھ کر نئی نسل کے سامنے جمالِ قرآنی کے وہ دلکش دل گداز اور دل افروز گوشے آشکار کیے جو مُلّا کی گھناؤنی کہانیوں کے نیچے دبے ہوئے تھے ۔ حالیؔ ، اکبرؔ اور اقبالؔ زمین تیار کر چکے تھے ۔ برقؔ نے اس زمین کو گلہائے رنگ رنگ کی جنت بنا دیا ۔ اقبالؔ نے کہا تھا ۔

صد جہاں باقی ست در قرآن ہنوز
اندر آیاتش یکے خود را بسوز

برقؔ نے اس " صد جہاں " کے سراغ کی راہ نکال لی ۔ اب آنے والی نسلیں اس کو ڈھونڈیں گی اور پائیں گی ۔ اس کی زیر نظر تصنیف پاکستان اور آئینِ پاکستان کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کے حل کی طرف ایک مؤثر قدم ہے ۔

میں کہتا ہوں ، یہ ایک بم ہے ، ایٹم بم ۔ اِن تمام مصنوعی مذاہب کے لیے جو " اسلام " کے نام سے مسلمانوں کے اندر آتشِ فتنہ و تفریق بھڑکائے ہوئے ہیں ۔ یہ ایک دعوت ہے ۔ مؤثر دعوت قرآن کی طرف ۔ قرآن ہی ہے جس کے آگے سب اسلامی فرقوں کو جھکنا پڑے گا ۔ قرآن ہی ہے جو اپنے اندر ابدی قانون کی اساس رکھتا ہے ۔ قرآن ہی ہے ، جس میں ہماری تمام ملی بیماریوں کا علاج ہے ۔ قرآن ہی ہے جو بے منتِ شارحین و مفسرین ہمیں ہمیشہ پیدا ہونے والی نئی نئی فرقہ بندیوں اور مسیحیوں اور مہدیوں کے فتنوں سے نجات دلا سکتا ہے ۔ یہ آواز آج نہیں تو کل پاکستان کو اپنانی پڑے گی ۔ ملاؤں کا زور توڑنا پڑے گا ۔ موجودہ ملا و پیر

اسلام کے تابناک چہرے پر ایک جذامی پردہ ہے۔ جس کی وجہ سے اپنے پرائے سب اسلام سے بیزار ہو رہے ہیں۔ قدرت اب زیادہ دیر تک قرآن پر حدیث کے مظالم کو برداشت نہیں کرے گی۔ ملائیت کی موت قریب آ گئی ہے۔ ملائیت کی موت اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہو گی۔

آخر میں مَیں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی دو انسان جو فہم و فراست رکھتے ہوں، ہر بات میں متفق نہیں ہو سکتے۔ شریفانہ اختلاف عین منشاء فطرت ہے۔ موجب اصلاح و ارتقاء ہے راقم کو "دو اسلام" کے مصنف سے کئی جگہ اختلاف ہے۔ مسائل میں بھی اور انداز بیان میں بھی۔ ایسی تصنیف کے لیے جس سنجیدگی کی ضرورت ہے۔ کئی جگہ محترم مصنف اس کو ملحوظ نہیں رکھ سکے۔ ان کے قلم میں جوانی کا جوش ہے۔ ایک سخت قسم کی تڑپ ہے۔ اِس اِسلام کو پا بالینے کے لیے جو اُن کو قرآن میں نظر آیا ہے۔ وہ اس کے لیے تاخیر و انتظار کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں یہ انسانی فطرت ہے۔ جب ہمیں اِس قسم کی تلخ گوئی مجسمۂ عفو و صفح مسیح علیہ السلام کی زبان سے سننے میں آتی ہے تو ہم "دو اسلام" کے مصنف سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے مُلّاؤں، فقیہوں اور فریسیوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! ایک مرید

کرنے کے لیے خشکی اور تری کا دورہ کرتے ہو، اور جب وہ
مرید ہو چکتا ہے تو اُسے اپنے سے دونا جہنّم کا فرزند بناتے
ہو۔ اے اندھے راہ بتانے والو تم پر افسوس! —
اے احمقو اور اندھو! ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز
دکھائی دیتے ہو، مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے
بھرتے ہو — اے سانپو! اے افعی کے بچّو! تم
جہنّم کی سزا سے کیوں کر بچو گے۔" وغیرہ ذالک۔

اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو محتاط اور معتدل قسم کے اصحاب بھی مصنّف
سے سوء ظن رکھنے میں حق بجانب ہو سکتے تھے۔ لیکن اس نے نہایت
فراخدلی سے جا بجا اعتراف کیا ہے کہ وہ حدیثِ رسول کا مخالف
نہیں بلکہ ان منسوب الی الرسول باتوں کے خلاف مسلح ہو کر اٹھ رہا ہے۔
جو دشمنانِ اسلام یا اسلام کے نادان دوستوں نے وضع کر کے رسولؐ
کے نام پر مشتہر کر دیں اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت اور صف شکن
نظام کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور اس کا سینہ علمائے ربانی کے احترام سے
معمور ہے۔ جنہوں نے اصلاحِ مسلمین اور ترویجِ دین کی خاطر صعوبتیں برداشت
کیں۔ ہاں اس کا سارا زورِ قلم ان سوداگرانِ مذہب کے خلاف صَرف
ہوا۔ جنہوں نے اسلام کی پاکیزہ اور معطر فضا میں پادریت اور برہمنیت
کی مسموم و متعفن گیس پھیلائی۔ اور ساری اُمّت کے ذہن و دماغ کو ماؤف
کر دیا۔ میں اس سے زیادہ تعارف کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مجھ سے بہت

بہتر یہ دلچسپ، مفید اور معلومات سے بھری ہوئی کتاب اپنا تعارف آپ کرائے گی۔ اگر آپ کے دل پر قلائی زنگ کی تہیں نہیں چڑھ چکیں تو آپ اس کو پڑھتے جائیں گے اور ہاتھ سے نہیں رکھیں گے جب تک ختم نہ کر لیں۔

عرشی

لاہور

حرفِ ثانی

"دو اسلام" پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی تھی، اور آج ۱۹۵۸ء ہے۔ چونکہ کتاب کی زبان تلخ اور اندازِ تنقید بے باکانہ تھا۔ اس لیے بعض حلقوں میں آگ لگ گئی اور اس کتاب کے جواب میں بیسیوں مقالے اور نصف درجن کے قریب کتابیں لکھی گئیں جن میں میری تنقیدات کا جواب دیا گیا۔ تلخیٔ لہجہ کی شکایت کی گئی اور بعض اغلاط کو واضح کیا گیا۔ لیکن کوئی صاحب اس بات کو واضح نہ کر سکے کہ:

۱۔ حدیث وحی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو قرآن کا حصہ کیوں نہ بنی؟ خدا و رسولؐ اور صحابہؓ نے قرآن کی طرح اس کی حفاظت کیوں نہ کی؟ حضرت صدیقؓ نے اپنا مجموعۂ احادیث کیوں جلایا تھا اور فاروق اعظمؓ نے صحابہ کی احادیث کو کیوں سپردِ آتش کیا تھا؟

۲۔ کہ ایک ہی حدیث کو جب مختلف راوی بیان کرتے ہیں، تو الفاظ و جزئیات میں اختلاف کیسے پیدا ہو جاتا ہے؟ صحاح ستہ میں ایسے اختلافات کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ یہاں بطورِ نمونہ صرف ایک مثال درج کی جاتی ہے۔

مشہور حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام انسانی

صورت میں حضور صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے ، اور چند سوالات پوچھے یہ مکالمہ بخاری و مسلم نے یوں بیان کیا ہے:۔

پہلا سوال ۔ ما الایمان (ایمان کیا ہے)

جواب ۔ بخاری میں ۔ قال الایمان ان تومن باللہ وملائکتہٖ وبلقائہٖ ورُسلہٖ وتومن بالبعث۔

(ایمان یہ ہے کہ تم اللہ ، فرشتوں ، خدا سے ملاقات ، رسولوں اور قیامت پہ ایمان لاؤ)

مسلم میں دو جواب ہیں:۔

۱۔ قال ان تومن باللہ وملائکتہٖ وکتابہٖ ولقائہٖ ورُسلہٖ وتومن بالبعث الآخر۔

(بہ روایت ابوہریرہ ج ۱ ص ۱۶۵)

ان دونوں جوابات میں چار اختلافات ہیں (۱) مسلم نے قال کے بعد الایمان چھوڑ دیا (۲) ملائکتہٖ کے بعد وکتابہٖ کا اضافہ کیا (۳) بخاری میں بلقائہٖ ہے اور مسلم میں ولقائہٖ (۴) بخاری میں بالبعث ہے اور مسلم میں بالبعث الآخر

۔ قال ان تومن باللہ وملٰئکتہٖ وکتبہٖ ورُسلہٖ والیوم الآخر وتومن بالقدر خیرہٖ وشرّہٖ الخ

(بہ روایت عمر بن الخطاب ج ۱ ص ۱۶۴)

(کہ تم خدا ، فرشتوں ، کتابوں ، رسولوں ، یوم آخر اور تقدیر خیر و شر پہ

ایمان لاؤ)

یہاں کتاب کی جگہ کتب ہے۔ اور ایمان بالتقدیر کا اضافہ بھی۔

دوسرا سوال تھا۔ ما الاسلام (اسلام کیا ہے؟)

بخاری کا جواب ہے۔ اَن تعبد اللہ ولا تُشرک بہٖ شیئاً

وتقیم الصلوٰۃ ..... الخ

اور مسلم میں دو جواب درج ہیں۔ اَن تعبد اللہ ولا تُشرک

بہٖ شیئاً وتقیم الصلوٰۃ المکتوبۃ الخ

اور دوسری میں۔ وَ تحجّ البیت ان استطعت الیہ سبیلا

کا بھی اضافہ ہے۔

ایک اور سوال تھا۔ مَتیٰ الساعۃ (قیامت کب آئے گی؟)

بخاری کا جواب :

قال ما المسئول عنہا بِاَعلَم من السائل وساخبرک من اشراطھا اذا ولدت الامۃ رَبّھا واذا تطاول رعاۃ الابل البھم فی البنیان الخ

(فرمایا ۔ اس معاملہ میں تیرا علم سائل سے زیادہ نہیں۔ البتہ میں علامات قیامت بتا دیتا ہوں ۔ جب لونڈی کے بطن سے اس کا آقا پیدا ہوگا اور کالے اونٹ چرانے والے (یا اونٹوں کے کم عقل چرواہے) عالیشان محلات کے مالک بن جائیں گے الخ)

مسلم کے دو جواب

۱۔ ... قال ان تلد الامۃ (فرمایا جب لونڈی کے بطن سے اس...)

ربتها و ان ترى الحفاة العالة رعاء الشاء يتطاولون فى البنيان ... الخ
(بروایت عمر بن الخطاب مسلم ج ۱ صفحہ ۱۹۹)

کی مالکہ پیدا ہوگی اور بھیڑوں کے برہنہ پا برہنہ بدن اور مفلس چرواہے عالی شان محلات کے مالک بن جائیں گے۔

بخاری کے جواب اور مسلم کے اس جواب میں بہت فرق ہے وہاں لونڈی کے بطن سے آقا پیدا ہونے کا ذکر تھا اور یہاں مالکہ کا - وہاں محلات کے مالک اونٹوں کے گلے چرواہے تھے اور یہاں بھیڑوں کے برہنہ پا، برہنہ بدن اور مفلس گڈریئے۔

مسلم کا دوسرا جواب

اذا ولدت الامة ربها فلاك من اشراطها واذا كانت العراة الحفاة رؤس الناس فذاك من اشراطها واذا تطاول رعاء البهم فى البنيان فذالك من اشراطها الخ
(بروایت ابوہریرہ ج ۱ صفحہ ۱)

(جب لونڈی کے بطن سے اُس کا آقا پیدا ہوگا تو اسے علامتِ قیامت سمجھو جب برہنہ بدن اور برہنہ پا لوگ انسانوں کے سردار بن جائیں گے تو اسے بھی علامتِ قیامت سمجھو - جب بھیڑوں کے چرواہے عالیشان محلات کے مالک بن جائیں گے تو اسے بھی علامتِ قیامت سمجھو۔

یہ جواب نہ صرف بخاری کے جواب سے مختلف ہے، بلکہ خود مسلم کے پہلے جواب سے بھی کافی اختلاف رکھتا ہے - اور لطف یہ کہ مسلم

کہ دوسری روایت اور بخاری کی روایت کا آخری راوی ایک ہے۔ یعنی حضرتِ ابوہریرہ رضؓ ۔

قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ جبریلؑ کے پہلے سوال کے جواب میں حضور صلعم نے وکتابہٖ اور ایمان بالقدر کو فہرستِ ایمان میں شامل کیا تھا یا نہیں ۔ اگر کیا تھا ، تو بخاری کی حدیث میں اِن کا کیوں ذکر نہیں ۔ پھر حضور صلعم نے وکتابہٖ فرمایا تھا یا وَکُتُبِہٖ ؟ اگر کتابہٖ کہا تھا ، تو حضرت عمر رضؓ نے وکتبہٖ کہاں سے لیا ۔ اگر کتبہٖ فرمایا تھا ، تو حضرتِ ابوہریرہؓ کتابہٖ کہاں سے لے آئے ؟ چونکہ واقعہ ایک ہے ۔ اس لیے ایک ہی بات صحیح ہوسکتی ہے کہ یا تو حضور صلعم نے ایمان بالتقدیر والکتب کو شامل ایمان فرمایا تھا یا نہیں اگر فرمایا تھا ، تو بخاری کی روایت غلط ہے ۔ اور اگر نہیں فرمایا تھا تو مسلم کی روایات غلط ٹھہرتی ہیں ۔ ممکن ہے آپ یہ فرمائیں کہ یہ واقعہ بخاری کے راویوں نے اِس طرح بیان کیا تھا ، اور مسلم کے راویوں نے اُس طرح ۔ ان دونوں نے جیسے سُنا ، ویسے لکھ دیا ۔ ان کا کوئی قصور نہیں لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ صحیح واقعہ کس نے بیان کیا ہے ؟ مسلم نے یا بخاری نے ؟ دونوں صحیح نہیں ہوسکتے ۔ لونڈی کے سلسلے میں یا تو حضور نے ربّہا (آقا) کہا ہوگا یا ربّتہا (مالکہ) اور عالی شان محلات کا مالک یا تو سیاہ اونٹوں کے احمق چرواہوں

کو بنایا ہوگا، اورپابرہنہ پا، برہنہ بدن اور مفلس گڈریوں کو — اِن میں سے جو روایت بھی صحیح سمجھی جائے، دوسری خود بخود غلط ہوجاتی ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ راویوں کو پورا واقعہ بھول گیا تھا، اور جو جسے یاد رہا سُنا دیا، تو اِس پر بھی وہی اعتراض وارد ہوگا۔ کہ کس نے صحیح سُنایا؟ دونوں کا صحیح ہونا ناممکن ہے۔ پس لازماً ایک روایت واقعہ کے مطابق اور دوسری خلاف واقعہ ہوگی۔ اور یہ بھی امکان ہے کہ دونوں خلاف واقعہ ہوں۔

صحاح میں اِس طرح کی احادیث بے شمار ہیں۔ کہ واقعہ ایک ہے لیکن روایات میں بڑا اختلاف ہے اور اِن تمام کو بیک وقت صحیح کہنا ناممکن ہے۔ احادیث کے مشتبہ ہونے پر یہ داخلی شہادت اتنی زیادہ اور زبردست ہے کہ ایک طالب حقیقت کو کوئی دلیل اور کوئی تاویل مطمئن نہیں کرسکتی۔

صحابہؓ میں اِختلافِ احادیث میرے نقّاد اِس امر پر مُصر ہیں۔ کہ عہدِ صحابہ میں احادیث اختلاف سے پاک تھیں۔ لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر اختلاف نہیں تھا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے صحابہ سے کیوں فرمایا تھا:

"تم لوگ آج احادیث میں اختلاف رکھتے ہو۔ آیندہ یہ اختلاف بڑھتا چلا جائے گا۔ اِس لیے تم آنحضرت ؐ سے کوئی احادیث روایت نہ کرو۔ اور اگر کوئی پوچھے

تو کہو ، کہ ہمارے پاس قرآن موجود ہے۔ جو اس نے جائز قرار دیا ہے۔ اسے جائز اور جسے ناجائز قرار دیا ہے اسے ناجائز سمجھو۔"

(تذکرۃ الحفاظ۔ ذہبی صہ ۳)

توجو احادیث حضرت ابوبکر رضہ کے عہد میں مختلف فیہ تھیں، وہ اڑھائی سو برس بعد امام بخاریؒ و مسلم کے دور میں کیسے صحیح اور متفق علیہ بن گئیں۔

دلچسپ بات

مولانا محمد داؤد راز (بمبئی) نے بھی "در اسلام" کا جواب لکھا ہے۔ عنوانِ کتاب ہے۔ "خالص اسلام" اس میں پہلے شبلیؒ کا ایک قول نقل کرتے ہیں۔ :

"حضرت ابوبکر رضہ نے پانچ سو حدیثیں قلم بند کی تھیں۔ لیکن پھر ان کو آگ میں جلا دیا اور کہا کہ ممکن ہے ایک شخص کو ثقہ سمجھ کر اُس کے ذریعے سے روایت کی ہو۔ اور وہ درحقیقت ثقہ نہ ہو۔"

(نقل از الفاروق صہ ۵۲)

اور پھر اس قول پہ یوں تبصرہ فرماتے ہیں :

"اس سے واضح ہو گیا ، کہ حضرت صدیق رضہ نے اِس مجموعہ کو مشکوک و مشتبہ ہونے کی وجہ سے تلف کر دیا تھا ، اور یہ آپ کا بہترین اقدام تھا ، کہ ایسا

نہ کیا جاتا، تو ایک مشکوک و مشتبہ چیز آپ کے توسط سے اشاعت پا جاتی۔"

(خالص اسلام صفحہ ۵۴)

حضرت صدیق رضؓ پورے تئیس برس تک آقائے نامدار کی خدمت میں رہے۔ آپ نے حضور صلعم کے ہزارہا اقوال و خطبات اپنے کانوں سے سُنے۔ ظاہر ہے، کہ انہوں نے جو مجموعۂ احادیث مرتب کیا تھا، وہ دیگر تمام مجموعوں سے صحیح ترین ہوگا۔ وہ کسی مشکوک روایت کی تصدیق خود رسالت پناہ سے کرا سکتے تھے۔ ہزارہا صحابہ بھی مدینہ میں موجود تھے۔ اگر ان تمام سہولتوں کے باوجود انہوں نے اپنے مجموعے کو مشکوک سمجھ کر جلا ڈالا تھا، تو پورے اڑھائی سو سال بعد امام بخاری و مسلم کے مجموعے کیسے صحیح ہو گئے؟ اور ان کی روایتیں کیسے وحی خفی بن گئیں؟

حضرت صدیق و عمرؓ کی روایات

ہمارے محدثین لکھتے ہیں، کہ حضرت صدیق رضؓ سے ۱۴۲ احادیث مروی ہیں۔ جن میں سے صرف ۶ متفق علیہ ہیں۔ ان میں سے بخاری نے گیارہ اور مسلم نے صرف ایک روایت درج کی ہے۔ اسی طرح حضرت فاروق اعظم ۵۳۹ احادیث کے راوی بتلائے جاتے ہیں۔ ان میں سے متفق علیہ صرف دس ہیں۔ بخاری نے ان کی دس اور مسلم نے پندرہ روایات لی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یوں تو حضرت صدیق کی وہ روایات جن کی صحت پر تمام ائمہ حدیث متفق ہیں، صرف چھ ہیں، لیکن امام بخاری کی صحیح میں گیارہ درج ہیں۔ سوال

یہ ہے کہ کیا یہ باقی پانچ بھی صحیح ہیں ؟ اگر ہیں تو متفق علیہ کیوں نہیں؟ اور اگر مشکوک ہیں۔ تو صحیح بخاری میں کیسے آگئیں ؟

حضرت ابنِ عباس کا رویّہ

حضرت ابنِ عباس مشہور صحابی ہیں آپ کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ بشیر بن کعب العدوی آپ کے ہاں گئے اور احادیث سنانا شروع کردیں۔ لیکن ابن عباسؓ نے کوئی بات نہ سُنی اور نہ بشیر کی طرف دیکھا۔ بشیر نے شکایتاً کہا، کہ میں حدیث سُنا رہا ہوں، اور آپ سُنتے ہی نہیں۔ آپ نے جو جواب دیا وہ دو طرح منقول ہے۔:

اوّل

انا کنا نحدث عن رسول الله صلعم اذ لم یکن یکذب علیه فلما رکب الناس الصعب والذلول ترکنا الحدیث عنه	(حضور صلعم کی طرف جھوٹی روایات منسوب ہونے سے پہلے ہم حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ لیکن جب سے لوگوں نے سچ اور جھوٹ کو ملا دیا ہے، ہم نے حضورؐ سے حدیثوں کی روایت ترک کردی ہے۔)

(مسلم مع فتح الملہم ج۔ ا صفحہ ۱۲۵)

دوسرے جواب کا آخری حصہ یوں ہے۔

..... لم ناخذ من النّاس الّا ما نعرف	کہ جب سے لوگوں نے سچ جھوٹ کو ملا دیا ہے۔ ہم لوگوں سے وہی حدیثیں لیتے ہیں

(مسلم ج۔ ا صفحہ ۱۲۸) ~~~ متقی) ہیں۔ جس کی صداقت کا ہمیں یقین ہو)

مُغیرہؓ کا قول ہے:-

لم یکن یُصدّق علیٰ علیؓ فی الحدیث عنہ اِلّا من اصحاب عبداللہ بن مسعود۔

(کہ عبداللہ بن مسعود کے ساتھیوں کے سوا باقی جن لوگوں نے حضرت علیؓ سے احادیث روایت کی ہیں۔ وہ قابلِ اعتماد نہیں)

(مسلم ج۔ ا صفحہ ۱۲۹)

ان اقوال سے واضح ہے، کہ خود صحابہ کے عہد ہی میں حدیث کا سرچشمہ مکدّر ہو چکا تھا۔ اور سچ میں جھوٹ اس قدر مل گیا تھا، کہ حضرت ابنِ عباس رضؓ نے احادیث کو سُننا تک چھوڑ دیا تھا۔ حضرت صدیق رضؓ نے اپنا مجموعہ جلا ڈالا تھا اور حضرتِ فاروق رضؓ نے مدینہ بھر کا ذخیرۂ حدیث نذرِ آتش کر دیا تھا۔ جب خود صحابہ کے دور میں احادیث کی کیفیت یہ تھی، تو وہی احادیث اڑھائی سو برس بعد "وحیِ خفی" کا درجہ کیسے حاصل کر سکتی تھیں؟

احادیثِ صحیحہ

میرے نقّاد مجھے مُنکرِ حدیث ٹھہراتے ہیں۔ اُن کا یہ خیال صحیح نہیں۔ اربابِ حدیث سے میرا اختلاف تین باتوں میں ہے۔ یہ حضرات حدیث کو "وحی" (خفی) سمجھتے ہیں، ان پہ قرآن کی طرح ایمان لاتے ہیں، اور صحاح ستہ کی تمام احادیث کو صحیح سمجھتے ہیں۔ میرا مؤقف یہ ہے، کہ حضور صلعم پر

بوساطت وحی صرف قرآن نازل ہوا تھا کہ احادیث حضورؐ کے بشری اقوال تھے۔ جن میں انتہادر کی تحریف ہوئی۔ کہ صحاح کی ساری احادیث صحیح نہیں۔ رہا یہ امر کہ آیا کوئی حدیث صحیح ہے بھی یا نہیں ؟ تو اِس کے متعلق میرا نقطۂ نظر یہ ہے۔ کہ صحت کے دو مفہوم ہیں۔ اوّل یہ کہ کسی حدیث کی نسبت حضور صلعم کی طرف صحیح ہو۔ اِن معنوں میں کوئی بھی حدیث یقینی طور پر صحیح نہیں۔ دوم یہ کہ حدیث کا مضمون قرآن سے متصادم نہ ہو اور اِن معنوں میں ہزارہا احادیث صحیح ہیں۔ جب ہم گلستان، بوستان بہارِ دانش اور مثنوی مولانا رومی کی حکایات سے لطف اندوز ہوتے اور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جب ہم امام غزالی کی "احیاء العلوم" سقراط کے "اشعارِ زریں" اور شیخ عبدالقادر گیلانی کی "غنیۃ الطالبین" کو زندگی میں شمعِ راہ بناتے ہیں تو پھر صحیح احادیث سے درس لینے میں کون سا امر مانع ہے۔

اِس وقت ایک طرف اہلِ حدیث و اہلِ سنت سے علماء ہیں جو صحاح کے ہر رطب و یابس کو واجب الایمان قرار دیتے اور ہر حدیث کے دفاع پر سر دھڑ کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔ اور دوسری طرف ایک ایسا گروہ ہے، جو حدیث کے تمام تر ذخیرے کو سوختنی قرار دیتا ہے۔ اِن دو انتہاؤں کے درمیان رہِ اعتدال یہی ہے کہ صحیح المضمون احادیث کو صحیح سمجھ کر اُن سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اور دیر و زود دونوں گروہوں کو یہ راہ اختیار کرنا ہی پڑے گی۔

کتابتِ احادیث بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے، کہ چند صحابہ نے کچھ احادیث لکھ لی تھیں۔ خود حضور صلعم نے بھی چند خطوط، فرامین اور معاہدات قلمبند کرائے تھے۔ حیدر آباد دکن کے پروفیسر حمید اللہ نے حضورؐ کے یہ فرامین و معاہدات وغیرہ ایک جلد میں جمع کر دیے ہیں۔ جس کا نام ہے۔" الوثائق السیاسیہ " اور کچھ احادیث اس مضمون کی بھی موجود ہیں۔ کہ حضور نے کتابت احادیث سے روک دیا تھا۔ نیز روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیقؓ و فاروقؓ ذخائر احادیث کو جلاتے بھی رہے۔ ان حالات میں کسی مجموعۂ احادیث کا باقی رہ جانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ کوئی مجموعہ بچ گیا تھا، تو یہ فیصلہ کرنا کہ اس کی کونسی روایت ہمارے وضاعین و محرّفین کی دستبرد سے محفوظ رہی۔ مشکل تر ہے۔ مزید تفصیل کتاب میں ملاحظہ فرمایئے۔

لفظ مُلّا کی تشریح مَیں نے اس کتاب میں مُلّا پر بڑی لے دے کی ہے۔ کیوں؟ بہ دو وجوہ

اوّل۔ ائمۂ حدیث نے ایسے علماء و قضاۃ کی طویل فہرست دی ہے، جن کا کام حدیث گھڑنا تھا۔ دوم۔ ان وضعی حدیث کو پھیلانے کی تمام تر ذمہ داری مُلّا ہی پہ عائد ہوتی ہے۔ جو عقل و فہم سے کام لیے بغیر ہر حدیث کو لے اُڑا۔ اور بستی بستی اپنے وعظوں اور خطبوں میں بیان کرتا رہا۔ یہ خالی دعاؤں سے جنّت خریدنے اور ایک آدھ

نفل پڑھنے پر ہزار ہزار حج کا ثواب کا نامعقول تخیل کس نے پیدا کیا؟
قوم کو یہ کس نے سمجھایا کہ وہ کام کرے یا نہ کرے۔ خدا اسی کا ہے،
شفاعت اُسی کے لیے ہے اور جنت تو اُس کے باپ کی خاص جاگیر
ہے۔ مُلّا کسی خاص طبقے کا نام نہیں۔ بلکہ ایک خاص قسم کی ذہنیت ہے
یہ غلط ہے کہ درسِ نظامی کے فارغ التحصیل طلبہ سب کے سب
مُلّا ہوتے ہیں۔ اور سارے انگریزی خواں بشر۔ دیوبند، سہارن پور،
خیرآباد، لاہور، لکھنؤ اور دہلی کے مکاتب و مساجد سے شبیر احمد عثمانی
سید انور شاہ، رشید احمد گنگوہی، محمود الحسن، فضل حق خیرآبادی،
عبدالحی فرنگی محلی، عبدالحکیم سیالکوٹی، ثناء اللہ امرتسری، سید سلیمان
ندوی رحمۃ اللہ علیہم جیسے سینکڑوں علماء پیدا ہوئے۔ اور انگریزی
یونیورسٹیوں سے لاتعداد مُلّا بھی نکلے۔ مُلّا ایک ذات صد جہات ہے۔
جس کے تمام اوصاف بیان کرنا مشکل ہے اِس لیے چند موٹی موٹی علامات
حاضر ہیں۔

۱۔ مُلّا ذہناً نہایت تنگ نظر ہوتا ہے۔ کسی غیر مذہب کے آدمی کو
برداشت کرنا تو رہا ایک طرف، وہ اُن مسلمانوں کو بھی برداشت نہیں
کرسکتا، جن کی ڈاڑھی نہ ہو، جو انگریزی علوم پڑھتے ہوں اور
کوٹ پتلون پہنتے ہوں۔ بلکہ وہ ساتھ والی مسجد کے مُلّا کو بھی
برداشت نہیں کرسکتا۔ اُسے فاسق اور اُس کی مسجد کو مسجدِ ضرار
بنانے کے لیے کوئی نہ کوئی دلیل گھڑتا ہی رہتا ہے۔

۲۔ مُلّا علومِ جدیدہ کا دشمن ہوتا ہے۔

۳۔ کافر و فاسق بنانے میں یدِ طُولیٰ رکھتا ہے۔

۴۔ لوگوں کے گھر سے کھاتا ہے اور خود کبھی نہیں کھلاتا۔ کھاتے وقت منہ سے سُڑر سُڑر کی خوفناک آوازیں نکالتا اور ریش و سُبل کو شوربے میں بھگو لیتا ہے۔

۵۔ یہ شاہراہوں پر ڈھیلا کرتا اور دوسروں کو اس نمائش کی ترغیب دیتا ہے۔

۶۔ اپنے معتقدوں کو خوش کرنے کے لیے جنّت و مغفرت کے نہایت آسان نسخے جعلی احادیث سے ڈھونڈ لاتا ہے۔

۷۔ تاریخِ عالم سے نا آشنا۔ حالاتِ دہر سے بے خبر اور سیاسیات سے قطعاً نابلد ہوتا ہے۔

۸۔ قلیل العلم ہونے کے باوجود اپنے علم پر سخت مغرور ہوتا ہے۔

۹۔ بحث و مناظرہ میں سخت کج بحثی سے کام لیتا ہے۔ یعنی اگر حیاتِ مسیح کا مسئلہ زیرِ بحث ہو۔ تو وہ مخاطب سے یہ پوچھتا ہے۔ کہ "مسیح کیا صیغہ ہے۔ کون سا باب ہے۔ مہموز یا مضاعف، موجبہ کُلیہ کا عکس کیا ہوتا ہے اور سیبویہ کی بکری کے کان ایک منٹ میں کتنی مرتبہ ہلتے تھے؟"

۱۰۔ گذشتہ فقہا و ائمہ سے اتنا مرعوب ہوتا ہے کہ اُن کے فرمودات سے سرتابی تو رہی ایک طرف، اُن پر تنقیدی نظر ڈالنے کی بھی

جرأت نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی مجھ جیسا سرپھرا تنقید کر بیٹھے تو وہ وہ ملاحیاں سُناتا ہے کہ تہذیب کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔

۱۱۔ اس کی لغات میں سنجیدگی کا لفظ ہوتا ہی نہیں۔ ذرا سے اختلاف پر یہ اپنے مدِ مقابل کی وہ خبر لیتا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔

میں نے اِس کتاب میں جہاں کہیں ملا کا ذکر کیا ہے، اِس سے مراد مذکورۃ الصفات ہستی ہے، نہ کہ شبلی و حالی جیسے علمائے کرام میرے ناقدین نے مجھ پہ یہ ستم کیا ہے کہ سید سلیمان ندوی و شبلی جیسے حضرات کو بھی میرے مُلا کے مفہوم میں شامل کر دیا ہے۔

میرے نقاد

"دو اسلام" کے جواب میں اس وقت تک جتنی کتابیں نکلی ہیں اُن میں سے قابلِ توجہ چار ہیں۔

۱۔ "ایک اسلام" از مولانا فضل احمد غزنوی شیخ الحدیث مکہ حال حیدر آباد سندھ

۲۔ "فتنۂ انکارِ حدیث" از مولانا افتخار احمد بلخی۔ کراچی۔

۳۔ "صرف ایک اسلام" از مولانا محمد سرفراز خان خطیب۔ گکھڑ۔

۴۔ "خالص اسلام" از مولانا محمد داؤد راز بمبئی

ایک لحاظ سے مَیں ان حضرات کا مشکور ہوں۔ اور خصوصاً مولانا محمد سرفراز خان کا، کہ انہوں نے میری بعض اغلاط واضح کیں۔ موجودہ ایڈیشن کو ان اغلاط سے پاک کر دیا گیا ہے اور تحریر کی تلخی کو بھی بڑی حد تک کم کر دیا گیا ہے۔ اغلاط کی نوعیت یہ تھی کہ ایک جگہ میں ایک

دعا کو آیت سمجھ کر لکھ گیا تھا۔ تین چار مقامات پر عربی متن کا ترجمہ نافہمی سے غلط کر ڈالا تھا۔ اور دو چار جگہ تنقید غلط ہو گئی تھی۔ اِن کتابوں سے اتنا ہی فائدہ ہوا کہ میں ان اغلاط سے بچ گیا۔ رہا اصل موضوع کہ حدیث وحی ہے یا نہیں اور صحاح کی تمام احادیث صحیح ہیں یا نہیں۔ جُوں کا توں رہا۔ اور یہ حضرات میرے علم میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔

مولانا محمد سرفراز کے سوا کہ اُنہوں نے کتاب میں کافی حد تک سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ باقی حضرات نے سب وشتم کا وہ مظاہرہ کیا ہے کہ شاید ہی کوئی شستہ مذاق انسان اِن کا ایک صفحہ بھی پڑھ سکے۔ چونکہ اِن تمام حضرات کی نیت نیک تھی، اس لیے میں انہیں معاف کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ہم سب کو صداقت و حقیقت کی روشن منزل کی طرف رہنمائی کرے۔

برق

۱۵ جولائی ۱۹۵۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیث میں تحریف

جب پہاڑ کے دامن سے کوئی چشمہ پھوٹتا ہے۔ تو اس کا پانی صاف شفاف ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں وہ میدانوں کی طرف بڑھتا ہے، خس و خاشاک اور خاک وغبار کی وجہ سے گدلا ہوتا جاتا ہے۔ یہی حال مذہب کا ہے۔ آج سے ۱۳۶۸ برس پہلے اسلام کا چشمہ دامنِ فاران سے پھوٹا اور کئی دھاروں میں بٹ کر مشرق و مغرب کی طرف بڑھا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں مختلف الانواع کثافتیں شامل ہوتی گئیں۔ کہیں عیسائیوں کی رہبانیت اس میں آملی اور کہیں آریوں کا نظریۂ حلول و وحدت الوجود، راہ میں کہیں تصوف کی دلدلیں آگئیں اور کہیں کلام و اعتزال کے خاک ان ان مختلف گزرگاہوں سے ہوتا اور اس طویل راہ گزر کی آلودگیوں کو سمیٹتا ہوا جب یہ چشمہ ہم تک پہنچا تو ہم فیصلہ نہ کر سکے کہ یہ الہامی بلندیوں کا منظر آب تھا۔ یا کسی بدررو کا مکدر پانی۔ اہل نظر لرز رہے، اور متلاشیان حق بے تابانہ منبع کی طرف بڑھے۔ تاکہ ان مقامات کا کھوج لگائیں جہاں سے کثافت اس چشمے میں شامل ہو رہی تھی، سفر لمبا تھا، منزل کٹھن، راہبر ناپید، خانہ ساز عقائد کی گھٹائیں محیط اور راہ تاریک ماحول میں گم۔

ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ (ظلمت تہ بر تہ)

بیسیوں جی ہار کر بیٹھ گئے۔ اور کچھ ان ستاروں کی مدھم روشنی میں آگے بڑھتے گئے۔ جو گھٹاؤں کی چلمن سے اِن راہ نوردوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ جوں جوں وہ بڑھتے گئے۔ گھٹائیں چھٹتی گئیں، ظلمت سرکتی گئی۔ پردے اٹھتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ ایسے خطوں میں جا پہنچے۔ جہاں آفتاب الہام کی تجلیوں سے نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں، اور دل و دماغ منور۔ ہر حقیقت وہاں عیاں تھی اور ہر راز بے حجاب، انھوں نے ملت کو بلند آواز سے پکارا اور کچھ کہا۔ یہ آواز چند کانوں سے ٹکرائی اور پھر گونج بن کر دشت کی پنہائیوں میں گم ہو گئی۔

جانتے ہو انھوں نے کیا کہا تھا؟ یہی کہ ہمارے شکم پرست اور خود بین سامریوں نے حرمِ حقیقت میں سیکڑوں بُت بنا رکھے ہیں۔ جن میں ایک کا نام "وضعی احادیث" ہے۔ یعنی وہ اقوال جو لوگوں نے تراش کر حضور صلعم کی طرف منسوب کر دیے تھے اور آج وہ اقوال رسول صلعم کے ساتھ یوں خلط ملط ہو چکے ہیں کہ حق کو باطل سے علیحدہ کرنا ناممکن ہو رہا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ ہمارے بعض علماء نے سچ کو جھوٹ سے علیحدہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ راویوں کا سراغ لگایا، اُن کے حالات جمع کیے بہ اندازہ ہمت تحقیق کی۔ لیکن معاملہ اس قدر اُلجھ چکا تھا کہ اُسے سلجھانا انسانی دسترس سے باہر تھا۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ علم کم تھا، لکھنے والے محدود اور ذخائر علم معدوم۔ صحابہ کی تمام تر توجہ قیامِ سلطنت۔ نشر

اسلام اور تعمیر ملت پہ صرف ہو رہی تھی۔ اُن کے پاس خود رسول موجود تھے۔ اور رسول کے بعد آپ کا دیا ہوا اکمل و اتم ضابطۂ حیات یعنی قرآن۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ڈیڑھ سو سال بعد لوگ قرآن کو چھوڑ کر احادیث پہ جھک پڑیں گے۔ احادیث کا ذخیرہ بڑھتے بڑھتے چودہ لاکھ تک پہنچ جائے گا۔ ہزار ہا اہل غرض لاکھوں احادیث گھڑ کر اس مقدس ذخیرے میں شامل کر دیں گے۔ اور اُس وقت مسلمانوں کو صحیح و غلط میں امتیاز کی ضرورت پیش آئے گی۔ اگر انھیں یہ معلوم ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال جمع کر جاتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔ اس کی بڑی بڑی وجوہ دو تھیں۔

اوّل۔ وہ قرآن کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے۔ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ جب رحلت سے پہلے حضور نے فرمایا کہ

اِیْتُوْنِیْ بِکِتَابٍ وَ قِرْطَاسٍ اَکْتُبُ لَکُمْ شَیْئًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ۔	لاؤ قلم دوات اور کاغذ میں تمھیں ایک ایسی چیز لکھ کر دے جاؤں کہ میرے بعد تمھاری گمراہی کا کوئی امکان باقی نہ رہے

تو حضرت عمر رضی بن خطاب جھٹ بول اٹھے ہمیں کسی مزید تحریر کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے پاس کتاب الٰہی موجود ہے جس میں انسانی فلاح و نجات کے مکمل گُر درج ہیں، اور یہ کتاب ہمارے لیے کافی ہے۔ حضرت فاروق کا یہ عمل رسالت پناہ کے حضور میں جسارت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ جو رشتے اس

لیے کہ کچھ عرصہ پیشتر قرآن کی یہ آیت نازل ہو چکی تھی:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تمہیں پوری طرح عطا کر دی ہے

اس آیت کی رُو سے نسل انسانی کی یہ کتاب ہر طرح مکمل اور پوری ہو چکی تھی۔ اس آیت کے ہوتے ہوئے کسی مزید ہدایت کا انتظار بے کار تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ایمان کا امتحان لے رہے ہوں۔ اس لیے حضرت فاروق رض کا یہ جواب نہایت برمحل معلوم ہوتا ہے۔ دوم۔ حضور ؐ نے حدیث لکھنے سے روک دیا تھا۔

عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی شیئاً غیر القرآن فلیمحہ

ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قرآن کے بغیر میرا کوئی اور قول قلمبند نہ کرو۔ اور اگر کوئی شخص ایسا قول لکھ چکا ہو تو اُسے مٹا دے۔

(صحیح مسلم)

اور اس کی دو وجہیں تھیں:

اول۔ کہ کہیں غلطی سے احادیث قرآن کے متن میں شامل ہو جائیں۔ بعض گذشتہ انبیا کے الہامی صحائف ہیں اُن کی احادیث بھی شامل ہو گئیں تھیں اور کتابِ الہٰی کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔

دوم ۔ خود رسول کریم صلعم کی زندگی میں اُن کے اقوال محترف ہو چکے تھے اور یہ ہے بھی ایک فطری چیز۔ آدمی کو اپنی کہی ہوئی بات تک یاد نہیں رہتی، وہ دوسرے کی کیا یاد رکھ سکتا ہے ۔ فرض کرو کہ ایک محفل میں چھ آدمی گھنٹہ بھر گفتگو کرتے رہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اختتام مجلس پر تمام گفتگو بالفاظہٖ دہرا سکیں؟ ناممکن ہے۔ اسی طرح فرض کرو کہ ایک واقعہ کو پچاس آدمی دیکھتے ہیں۔ اگر آپ ان کے پاس علیحدہ علیحدہ جا کر اس واقعے کی تفصیل قلمبند کریں، تو آپ کو ان تفاصیل میں کافی اختلافات نظر آئیں گے اور اگر چھ ماہ یا سال بعد انہی لوگوں کے پاس جا کر اسی واقعہ کی تفصیل دوبارہ قلمبند کریں تو یہ اختلاف اَور نمایاں ہوگا اَور مُرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ تفاصیل یوں بدلتی جائیں گی کہ ان کا تعلق حقیقت سے منقطع ہو جائے گا۔

حضور علیہ السلام انسان کی اس فطری کمزوری سے آگاہ تھے۔ اس اس لیے آپ نے حکم دے دیا تھا کہ میری حدیث قید کتابت میں مت لاؤ۔ ممکن ہے کہ آپ یہ کہیں کہ انسان اپنے یا اپنے ساتھی کی بات تو بھول سکتا ہے لیکن وہ اپنے رہبر اَور محبوب پیمبر کی بات نہیں بھول سکتا۔ میں عرض کر دوں گا کہ آپ یہاں بھی غلطی پر ہیں۔ آپ میں سے لاکھوں نے اپنے محبوب و محترم لیڈر حضرت قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بیسیوں تقاریر سنی ہوں گی۔ جنھیں بعد میں پاکستان ریڈیو نے بھی بار ہا دہرایا۔ لیکن آپ میں سے کتنے ایسے ہیں جنھیں آج اُن تقاریر کے

تین فقرے بھی یاد ہوں۔ انسان ہے ہی فراموش کار وہ سُنتا ہے۔ اور بھول جاتا ہے۔ آپ کو تاریخ کا یہ اہم واقعہ یاد ہو گا کہ حضرت فاروقؓ کے زمانے میں عراق کا قرآن حجاز سے مختلف ہو گیا تھا۔ کیوں؟ اس لیے نہیں کہ کوئی بدنیت تحریفِ قرآن پہ تل گیا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ ان کے سامنے قرآن کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا۔ اس لیے بعض آیات حافظہ سے اُتر گئیں۔ اور بعض میں کچھ رد و بدل ہو گیا تھا۔ حضرت فاروقؓ نے اس کا علاج یہ کیا کہ قرآن کے کافی نسخے لکھوا کر قلمرو کے مختلف حصوں میں بھیج دیئے اور قرآن تحریف سے محفوظ ہو گیا۔ ابن حزم لکھتے ہیں کہ حضرت فاروقؓ کی رحلت کے وقت قرآن شریف کے ایک لاکھ نسخے تیار ہو چکے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ صحابہ کرام عشقِ خدا میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور اُن کا یہ محکم عقیدہ تھا کہ کسی آیت کو غلط پڑھنا اگر کفر نہیں تو فسق یقیناً ہے۔ اگر ان عاشقانِ خدا کو قرآن کی آیات بھول گئیں تھیں تو حدیث کے بھولنے پہ انھیں کون ملامت کر سکتا تھا۔

آنحضرت صلعم نے کتابت حدیث سے منع فرمادیا تھا۔ اور جو چیز لکھی نہ جائے۔ وہ لازماً پہلے بگڑتی اور بالآخر مٹ جاتی ہے حضورؐ کا مقصد بھی یہی تھا۔ کہ قرآن حکیم کے بغیر کوئی اور کتاب ہدایت باقی نہ رہے۔ اِس لیے کہ حضورؐ اور ان کے صحابہ قرآن کو ایک مکمل ضابطۂ حیات تصور فرماتے تھے۔ اور اس کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی قطعاً

ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ورنہ اگر صحابہ کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال آتا کہ قرآن کی تفصیل، تکمیل، تفسیر، یا اُمت کی رہبری کے لیے حدیث کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ تو ان کے لیے حدیث کی تدوین نہایت آسان تھی جو عمرؓ قرآن کے ایک لاکھ نسخے لکھوا سکتا تھا۔ وہ پانچ چھ ہزار احادیث کا ایک مجموعہ بھی تیار کرا سکتا تھا۔ تمام صحابہ زندہ تھے اُن کی بیشتر تعداد مدینے میں موجود تھی۔ اور بعض روایات کے مطابق، حضرت عبداللہ بن عمروؓ حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس احادیث کی کافی تعداد لکھی ہوئی بھی تھی۔ زاویوں کا لمبا چوڑا جھمیلا بھی نہیں تھا۔ ان حالات میں اگر حضرت صدیقؓ یا فاروقؓ چاہتے تو صرف ایک مہینے میں سرورِ عالمؐ کے تمام اقوال جمع ہو سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔ کیوں؟ کیا انھیں اقوال رسولؐ سے معاندت تھی؟ عیاذاً باللہ! کیا انھیں اسلام سے محبت نہیں تھی؟ استغفراللہ! بات یہی تھی کہ اقوال رسول میں تحریف ہو چکی تھی۔ نیز رسول اکرم صلعم کا حکم تھا۔ کہ احادیث مت لکھو۔ مزید برآں انھیں اس حقیقت پر بھی محکم ایمان تھا کہ قرآن ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس لیے انھوں نے احادیث کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

علاّمہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت صدیقؓ کے مجموعے سے زیادہ قابلِ اعتماد اور کون سا مجموعہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ایک

صبح اٹھ کر اسے جلا دیا

حضرت فاروق رضؓ کے متعلق مذکور ہے کہ آپ نے رسول اکرم صلعم کی احادیث اور آپ کا اسوہ لکھوانے کا ارادہ کیا۔ مہینہ بھر استخارہ کرتے رہے۔ اور پھر فرمایا:۔

کانوا قبلکم قوما کتبو تم سے پہلے ایسی قومیں گزر چکی ہیں،
کتبا فاکبوا علیھا و ترکوا جنھوں نے کتابیں لکھیں اور خدا کی
کتاب اللہ و انی واللہ لا کتاب کو چھوڑ کر انہی پہ جھک پڑیں خدا کی قسم! میں
اشوب کتاب اللہ بشیئ ابداًا قرآن میں ایسی آمیزش ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔

نامناسب نہ ہوگا، اگر اس سلسلے میں چند اور تاریخی واقعات بھی بیان کر دیئے جائیں۔

(۱) جب حضرت صدیق رضؓ مسند خلافت پہ جلوہ آرا ہوئے تو آپ نے ایک دن ایک مجمع عام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"تم لوگ آج حدیث میں اختلاف رکھتے ہو (ہم یہی عرض کر رہے تھے کہ اقوال رسول صلعم میں رد و بدل ہو چکا تھا اور وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ انھیں قلمبند کیا جاتا) آئندہ یہ اختلاف بڑھتا چلا جائے گا۔ اس لیے تم آنحضرت سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ اگر کوئی پوچھے تو کہو کہ ہمارے پاس قرآن موجود ہے۔ جو اس نے جائز قرار دیا ہے اُسے ناجائز سمجھو۔"

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی ص۳)

(۲) ایک مرتبہ حضرت فاروق رضؓ نے تمام صحابہ سے فرمایا کہ گھر جاؤ

سلہ کتاب جامع بیان العلم از حافظ ابن عبدالبر طبع مصر سنہ ۱۳۲۰ھ ص۳۳

اور احادیث کا تمام ذخیرہ اُٹھا لاؤ۔ جب یہ ذخیرہ جمع ہو گیا تو آپ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے جلا دیا۔

(طبقات ابن سعد ج ۵ صفحہ ۱۴۰)

ذرا سوچو کہ خلفائے راشدین کا زمانہ ہے۔ شمع نبوّت پہ فدا ہونے والے ہزاروں پروانے موجود ہیں۔ اور حضورؐ کے دو سب سے بڑے دوست اور فدائی آپ کے اقوال کا ذخیرہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کر رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا انھیں ارشاداتِ رسولؐ سے ضد تھی؟ یا اقوال رسول میں تحریف ہو چکی تھی؟ ظاہر ہے کہ پہلی وجہ غلط ہے۔ اور دوسری صحیح۔ مقام حیرت ہے کہ جن احادیث کو مشتبہ یا ناقابلِ التفات سمجھ کر صدیق و فاروق رضی اللہ عنہم فنا کر رہے تھے۔ تاکہ اعمال و عقائد میں کوئی فتور پیدا نہ ہونے پائے۔ انہی احادیث کو اڑھائی سو سال بعد امام بخاری اور مسلم وغیرہ نے جمع کیا۔ اور ہم سب نے مل کر نعرہ لگایا۔

هٰذا اصحّ الکتب بعد کتاب اللہ

(قرآن کے بعد صحیح بخاری صحیح ترین کتاب ہے)

آخر کس طرح؟ چند ایک احادیث جو بعض صحابہ کے پاس تھیں، اُن میں سے بیشتر جلا دی گئیں۔ جو زبانوں پہ جاری تھیں۔ ان میں ہر لمحہ ردّ و بدل ہو رہا تھا۔ بات ایک دن میں کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ اور ان اقوال پر تو اڑھائی سو برس گذر چکے تھے۔ وہ صحابہ جن کی دیانت اور سچائی پر بھروسا کیا جا سکتا تھا، فوت ہو چکے تھے اور بعد میں آ گئے

صبح اٹھ کر اسے جلا دیا

حضرت فاروق رضؓ کے متعلق مذکور ہے کہ آپ نے رسول اکرم صلعم کی احادیث اور آپ کا اُسوہ لکھوانے کا ارادہ کیا۔ مہینہ بھر استخارہ کرتے رہے۔ اور پھر فرمایا:۔

کانوا قبلکم قوما کتبو تم سے پہلے ایسی قومیں گزر چکی ہیں

کتبا فاکبوا علیھا و ترکوا جنھوں نے کتابیں لکھیں اور خدائی

کتاب اللہ و انی و اللہ لا کتاب کو چھوڑ کر انہی پہ جھک پڑیں خدا کی قسم! میں

اشوب کتاب اللہ بشیئ ابدا قرآن میں ایسی آمیزش ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔

نامناسب نہ ہوگا، اگر اس سلسلے میں چند اور تاریخی واقعات بھی بیان کر دیئے جائیں

(۱) جب حضرت صدیق رضؓ مسند خلافت پہ جلوہ آرا ہوئے تو آپ نے ایک دن ایک مجمع عام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"تم لوگ آج حدیث میں اختلاف رکھتے ہو (ہم یہی عرض کر رہے تھے کہ اقوالِ رسول میں رد و بدل ہو چکا تھا اور وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ انھیں قلمبند کیا جاتا) آئندہ یہ اختلاف بڑھتا چلا جائے گا اس لیے تم آنحضرت سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ اگر کوئی پوچھے تو کہو کہ ہمارے پاس قرآن موجود ہے۔ جو اس نے جائز قرار دیا ہے اُسے ناجائز سمجھو"

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی صہ۳)

(۲) ایک مرتبہ حضرت فاروق رضؓ نے تمام صحابہ سے فرمایا کہ گھر جاؤ

لہ کتاب جامع بیان العلم از حافظ ابن عبدالبر طبع مصر سنہ ۱۳۲۰ھ صہ ۳۲

اور احادیث کا تمام ذخیرہ اُٹھا لاؤ۔ جب یہ ذخیرہ جمع ہو گیا تو آپ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے جلا دیا۔

(طبقات ابن سعد ج ۵ صفحہ ۱۴۰)

ذرا سوچو کہ خلفائے راشدین کا زمانہ ہے۔ شمع نبوّت پہ فدا ہونے والے ہزاروں پروانے موجود ہیں۔ اور حضورؐ کے دو سب سے بڑے دوست اور فدائی آپ کے اقوال کا ذخیرہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کر رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا انھیں ارشاداتِ رسولؐ سے ضد تھی؟ یا اقوال رسول میں تحریف ہو چکی تھی؟ ظاہر ہے کہ پہلی وجہ غلط ہے، اور دوسری صحیح۔ مقامِ حیرت ہے کہ جن احادیث کو مشتبہ یا ناقابلِ التفات سمجھ کر صدیق و فاروق رضی اللہ عنہم فنا کر رہے تھے، تاکہ اعمال و عقائد میں کوئی فتور پیدا نہ ہونے پائے، انہی احادیث کو اڑھائی سو سال بعد امام بخاری اور مسلم وغیرہ نے جمع کیا۔ اور ہم سب نے مل کر نعرہ لگایا۔

هٰذا اصحّ الکتب بعد کتاب اللہ

(قرآن کے بعد صحیح بخاری صحیح ترین کتاب ہے)

آخر کس طرح؟ چند ایک احادیث جو بعض صحابہ کے پاس تھیں، اُن میں سے بیشتر جلا دی گئیں۔ جو زبانوں پہ جاری تھیں۔ ان میں ہر لمحہ ردّ و بدل ہو رہا تھا۔ بات ایک دن میں کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ اور ان اقوال پر تو اڑھائی سو برس گذر چکے تھے۔ وہ صحابہ جن کی دیانت اور سچائی پر بھروسا کیا جا سکتا تھا، فوت ہو چکے تھے اور بعد میں آ گئے

تھے ہم جیسے لوگ۔ امام حسین کے قاتل، حضرت علیؓ کے باغی، کعبے کو ڈھانے والے حاکم شرابی، امرا راشی، غنی عیاش. فقیر پست کردار، کیا ایسے ماحول (اُمیہ کا دور) میں کسی حدیث کا اپنی اصلی حالت پہ رہنا ممکن تھا؟ بعض صحابہ سے بھی اخلاقی لغزشیں سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ بخاری میں مذکور ہے۔ کہ ایک صحابی روزے کی حالت میں جماع کر بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ابن نعمان کو شراب نوشی پہ سزا دی تھی۔ حضورؐ نے ایک صحابی پہ زنا کی حد جاری کی تھی۔ رحلت رسولؐ کے بعد بعض مرتد ہو گئے تھے، اور بعض نے زکواۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کی جنگ میں دونوں طرف صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ اور ظاہر ہے کہ دونوں راستی پہ نہیں ہو سکتے تھے۔ ان حالات میں بالکل ممکن ہے کہ کسی صحابی نے عمداً کسی حدیث کے الفاظ بدل دیئے ہوں۔ اور سہو و نسیان کا خطرہ تو ہر وقت تعاقب میں رہتا تھا۔ دو سو پچاس برس تک یہ حدیثیں کروڑوں زبانوں پہ جاری رہیں۔ ہر نیک و بد کے پاس پہنچیں۔ الفاظ بدلے۔ مفہوم بدلا۔ اضافے ہوئے۔ لاکھوں نئی احادیث وضع کی گئیں، جن میں حلال کو حرام، اور حرام کو حلال بنایا گیا۔ جہاد پہ ضرب کاری لگائی گئی۔ رہبانیت کو اُچھالا گیا، اور ایک ایک ورد پہ ہزار ہزار جنتیں تقسیم کی گئیں۔ ان مشتبہ، گوش بریدہ، اور خود تراشیدہ احادیث کا سیلاب عظیم جب حضرت امام بخاری کے دور میں داخل ہوا تو آپ نے چھ لاکھ

احادیث میں سے جو آپ کو یاد تھیں، صرف ۲، ۵، ۲ انتخاب کیں اور باقی تمام کو ناقابلِ اعتماد قرار دیا۔

آپ نے انتخاب کا معیار راویوں کی صداقت کو قرار دیا۔ امام بخاری اور رسولِ اکرم صلعم کے درمیان اڑھائی سو سال کا طویل زمانہ حائل تھا۔ چھ لاکھ حدیث، ہر حدیث کے کم از کم پانچ چھ راوی۔ یعنی تیس پینتیس لاکھ راوی، جن میں سے بیس پچیس لاکھ لازماً مر چکے ہوں گے۔ نہ اُن کے حالات محفوظ، نہ انھیں کوئی جاننے والا موجود۔ امام بخاریؒ کو کیسے پتہ چل گیا تھا کہ اس کے تمام راوی سچے تھے۔ اور کہ انھوں نے زندگی بھر میں نہ کوئی گناہ کیا تھا، اور نہ کبھی جھوٹ بولا تھا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں، کہ آپ کے معاصر یحییٰ بن معینؒ نے راویوں کے حالات قلمبند کیے تھے۔ لیکن اُن کے متعلق بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں یہ حالات کس نے بتلائے تھے۔ اور دو سو سال پہلے کے راویوں کے متعلق انھوں نے معلومات کہاں سے حاصل کی تھیں؟ اگر آج ہمیں کہا جائے کہ محلے کے تمام اُن لوگوں کے حالات قلمبند کرو، جو گذشتہ دو سال میں مر چکے ہیں، تو ہم کبھی نہیں کر سکیں گے۔ ممکن ہے۔ مجملاً ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں صاحب پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ لیکن اُس کے کردار کی صحیح تصویر کھینچنا ہمارے لیے ناممکن ہو گا۔

علاوہ ازیں ہمارے سوانح نگاروں میں ایک خاص نقص بھی تھا، کہ وہ کسی کے کردار پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے عادی نہیں تھے۔ ہمیشہ

حسن ظن سے کام لیتے تھے۔ اور مبالغہ آمیز مدح سرائی پہ اُتر آتے تھے۔ اس وقت ذہبی کا تذکرۃ الحفاظ میرے سامنے پڑا ہے۔ جس میں ہزار ہا بڑے بڑے راویان و حفاظِ حدیث کے حالات مرقوم ہیں۔ میں ایک ہی دور کے چند راوی لے کر ذہبی کی زبانی اُن کی کہانی سناتا ہوں۔ جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے، کہ ہمارے بزرگوں کا اندازہ کردار نویسی میں کیا تھا؟

مثلاً:

(۱) علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب کے متعلق لکھتے ہیں،

کانَ یُصلّی فی الیوم و اللیلۃِ اَلفَ رَکعۃٍ	آپ رات دن میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔

(تذکرہ ص ۷۶)

اگر سونے، کھانے، ضروری حاجات اور وضو کے لیے کم از کم آٹھ گھنٹے الگ کر لیے جائیں تو باقی سولہ گھنٹے بچتے ہیں۔ اگر ہر رکعت پر اوسطاً دو منٹ صرف ہوں تو یہ تینتیس گھنٹے اور بیس منٹ بنتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ سولہ گھنٹوں میں تینتیس گھنٹوں کا کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔

(۲) مطرف بن عبداللہ (وفات ۹۵ھ) کے متعلق لکھا ہے

کان راساً فی العلم والعمل	کہ آپ علم و عمل میں سردار تھے۔

(تذکرہ ص ۵۵)

(۳) محمد بن سیرین (وفات سنہ ۱۱۰ھ) کے متعلق کہا :

عزیز العلم۔ ثقۃ .... راس فی الورع

کہ آپ علم میں بے مثال، قابلِ اعتماد .... اور تقویٰ میں سردار تھے۔

(تذکرہ ص ۶۷)

(۴) طاؤس بن کیسان (وفات سنہ ۱۰۶ھ) کے متعلق فرمایا :

کان راساً فی العلم والورع

کہ علم و تقویٰ میں سردار تھا۔

(تذکرہ ص ۷۸)

(۵) ابوصالح ذکوان (وفات سنہ ۱۰۱ھ) کے متعلق ارشاد ہُوا :

من اجل النّاس و اوثقھم

سب سے بڑا اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد

(تذکرہ ص ۷۸)

(۶) شعبی کے متعلق کہا :۔

ما رایت اعلم وافقہ من شعبی

شعبی سے بڑا عالم اور بڑا عقلمند یا فقیہہ میں نے نہیں دیکھا۔

(تذکرہ ص ۷۰)

(۷) عکرمہ (وفات سنہ ۱۰۷ھ) کے متعلق لکھا :

ما بقی احد اعلم بکتاب اللہ من عکرمہ

کہ عکرمہ سے بڑا کتاب اللہ کا کوئی عالم موجود نہیں۔

(تذکرہ ص ۸۴)

(۸) القاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق (وفات ۱۰۶ھ) کے متعلق فرمایا:
مَا رایتُ فقیہاً اعلم من القاسم — کہ میں نے قاسم سے بڑا فقیہہ نہیں دیکھا۔

(تذکرہ ص ۸۴)

(۹) عطا بن ابی رباح (وفات ۱۱۴ھ) کے متعلق کہا:
مَا رایت افضل مِن عطاء — کہ میں نے عطا سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔

(تذکرہ ص ۸۴)

دیکھا آپ نے سوانح نویسی کا انداز۔ یہ سب محدثین ہم عصر تھے۔ ذہبی ہر ایک کو "بے مثال، سب سے بڑا عالم، سردار" قرار دے گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی زمانے اور قریباً ایک ہی ملک کے سب لوگ بے نظیر و بے مثال نہیں ہو سکتے۔ تو جن راویوں کے حالات ان مبالغہ پسند سوانح نگاروں نے اس فیاضی سے قلمبند کیے ہوں، اُن پر اعتماد کر کے کِسی قول کو بالکل صحیح سمجھ لینا درست نہیں۔

(۱۰) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے موطا (امام مالکؒ) کی ایک شرح لکھی تھی۔ جس کا نام "مُسَوّٰی" ہے۔ اس کے آخر میں کوئی اشفاق الرحمٰن صاحب، حضرت مالک کے حالات یوں قلمبند کرتے ہیں:

"...... امام مالک نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ حدیث لکھی۔ نو سو اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ اور سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر درس دینا شروع کر دیا ...... جب موطا لکھ چکے تو اُسے پانی میں پھینک کر کہنے لگے کہ اگر اس میں صحیح احادیث ہیں تو یہ نہیں بھیگے گی۔ چنانچہ وہ نہ بھیگی ایک دن حدیث پڑھا رہے تھے کہ بچھو کپڑوں میں گھس گیا۔ اُس نے سولہ مرتبہ امام صاحب کو کاٹا۔ لیکن امام صاحب نے درس ختم کر کے ہی اس کی طرف توجہ دی....."

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اس سوانح نگار کو حقیقت نگاری سے کتنی چڑ ہے۔ ہر فقرہ اپنی تردید آپ کر رہا ہے۔ نو سو اساتذہ سے پڑھا بھی، اور پھر سترہ برس میں فارغ التحصیل بھی ہو گئے۔ کوئی پوچھے کہ اُس زمانے میں نو سو اساتذہ عرب میں جمع کہاں سے ہو گئے تھے؟ اگر بالفرض ہو ہی گئے تھے، تو یہ نہ بتایا کہ امام مالک ہر استاد کے پاس کتنا عرصہ رہے تھے۔ اگر ایک اُستاد کے پاس صرف ایک مہینہ بھی بسر کیا تھا تو بھی اُن کا زمانۂ تعلیم پچہتر برس بنتا ہے حالانکہ وہ سترہ برس کی عمر میں تعلیم ختم کر چکے تھے۔ اس گپ کے علاوہ وہ کتاب نہ بھیگنے اور بچھو کاٹنے کا گپوڑ بھی قابل داد ہے۔

"تو یہ ہیں وہ سوانح نگار، جن کی تحریرات کو ہم وحی سمجھ کر بعض

راویوں کو سچا اور بعض کو جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ اور پھر ان سچے راویوں کی احادیث ایک کتاب میں جمع کر کے اس کا نام رکھ دیتے ہیں صحیح بخاری، صحیح مسلم" اور ساتھ ہی دنیا کو دھمکاتے ہیں کہ یہ وحی (خفی) ہے۔ اگر تم ان کتابوں پر ایمان نہ لائے، تو تمہارا نام جنتیوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے گا۔

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ حضرت صدیقؓ اور فاروقؓ حدیثوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کرتے رہے۔ اُن کے بعد کیا ہوا۔ اس سلسلے میں چند اور واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن یسار فرماتے ہیں۔ کہ ایک دن حضرت علیؓ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے حکم دیا کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد ہر شخص پہلا کام یہ کرے کہ جس کے پاس کوئی بھی تحریر ہو اُسے مٹا ڈالے کیوں کہ پہلی قومیں اپنے علما کی احادیث پہ چلنے اور کتاب اللہ کو چھوڑنے کی وجہ سے ہلاک ہو چکی ہیں۔ (مختصر جامع بیان العلم ص ۳۲)

(۴) علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ابی بن کعب جیسے جلیل القدر صحابی کو روایت احادیث کی بنا پر پیٹنے پر تل گئے تھے۔ اور اسی جرم میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوذر اور حضرت ابوالدردا جیسے عظیم المرتبت اصحاب کو قید کر دیا تھا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷)

ان صحابہ کو یہ سزا اس لیے نہیں ملی ہو گی، کہ لوگوں کو صحیح احادیث

سُنایا کرتے تھے۔ بلکہ اِس لیے کہ وہ صحیح و غلط میں امتیاز نہیں کر سکتے ہوں گے۔

(۵) آج حضرت عبداللہ ابن مسعود کی طرف سینکڑوں احادیث منسوب ہیں۔ لیکن ابو عمرو الشیبانی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابن مسعود کی خدمت میں برسوں رہا۔ اور اُن کے مُنہ سے کوئی حدیث نہ سُنی۔ ہاں جب کبھی مجبوراً کوئی حدیث بیان کرنی پڑتی تو خوف سے کانپنے لگتے، اور فرماتے۔ رسول اللہؐ نے غالباً یوں فرمایا تھا۔ یا یوں یا قریباً یوں۔

(تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۱۴)

یہ حال تھا اُن صحابہ کا، جن کے علم و فضل پر خود بارگاہِ رسالت کو ناز تھا۔ اور جن کے فضائل و فواضل ساری اُمت کے لیے سرمایۂ افتخار تھے۔ اندازہ لگا لیا آپ نے کہ یہ حضرات احادیث کے معاملے میں کس قدر محتاط واقع ہوئے تھے۔

(۶) ابی اسحٰق مرۃ سے اور مرۃ عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ کہا کرتے تھے:

"جب تمھیں حصول علم کی ضرورت پیش آئے، تو قرآن پڑھو اِس لیے کہ اس میں اوّلین و آخرین کا علم موجود ہے۔"

(تذکرہ ج ۱ ص ۱۲)

(۷) ایک شخص نے ابی بن کعب سے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت

کیجیے۔ فرمایا :

اِتَّخِذْ كِتَابَ اللهِ وَ اَرْضَ بِهٖ حَكَمًا — کتاب اللہ کو ہاتھ میں لو اور صرف اسی کے فیصلوں پر عمل کرو۔

(تذکرہ ج ۱ ص ۱۵)

(۸) حضرت عبد اللہ بن عباس سیکڑوں احادیث کے راوی ہیں۔ لیکن علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔ کہ رحلتِ رسول کے وقت آپ کی عمر صرف ۱۳ برس کی تھی۔

(تذکرۃ ج ۱۔ ص ۳۴)

"تیرہ برس کا بچّہ کسی حد تک غیر ذمّہ دار ہوتا ہے۔ اُسے کیا خبر کہ نبی دنیا میں کیوں آتا ہے؟ اس کے اقوال کو کیا اہمیت حاصل ہوتی ہے؟ اور اگر ان اقوال میں ردّ و بدل ہو جائے تو کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں؟ اس طرح کے غیر ذمّہ دار بچّے اور آنحضرت صلعم میں اسناد کی کوئی اور کڑی قائم نہ کرنا اور خود انھیں عاقل، بالغ، ثقہ سمجھ کر رسول اکرم صلعم سے بلا واسطہ روایت کے قابل قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔

(۹) ایک مرتبہ کاتب الوحی حضرت زید بن ثابت رضؓ معاویہ کے دربار میں گئے۔ امیر نے احادیث کی فرمائش کی۔ آپ نے چند احادیث سنائیں۔ اور منشی دربار ساتھ ساتھ لکھتا گیا۔ آپ نے وہ کاغذ لے کر پھاڑ ڈالا۔ اور فرمایا کہ رسول اللہ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا۔

(بیان العلم صہ ۳۲)

(۱۰) علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ عمر فاروقؓ کے مکان پر گئے۔ تین آوازیں دیں اور واپس چل دیے۔ حضرت فاروقؓ باہر نکلے۔ واپس جانے کا سبب پوچھا۔ تو کہا :

"رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ ہر گھر پر تین آوازیں دو۔
اگر صاحب خانہ نہ بولے تو لوٹ جاؤ۔"

حضرت عمرؓ نے کہا اس حدیث پر فوراً شہادت پیش کرو ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔ وہ گھبرائے ہوئے مسجد نبوی میں پہنچے اور خوش قسمتی سے انھیں شہادت مل گئی، ورنہ شاید پٹ جاتے۔

(تذکرہ ج ۱ ص ۶)

(۱۱) اسود بن ہلال کوفی (وفات ۸۴ھ) کہتے ہیں کہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک بیاض یا کتاب لے کر گیا جس میں کچھ احادیث درج تھیں۔ آپ نے پانی منگوا کر اس کتاب کو پہلے دھویا اور پھر جلا دیا۔

(جامع صہ ۳۳)

(۱۲) ضحاک بن مزاحم (وفات ۱۰۵ھ) فرمایا کرتے تھے :۔

"وہ زمانہ جلد آ رہا ہے۔ جب احادیث کی کثرت ہو جائیگی، لوگ کتاب الہیٰ کو ترک کر دیں گے۔ مکڑیاں اس پر جالے تنیں گی، اور وہ گرد و غبار کے نیچے یوں دب جائے گی کہ نظر تک نہیں آئے گی۔"

(جامع صہ ۳۳)

(۱۳) عبدالرحمٰن بن الاسود بیان کرتے ہیں کہ میرے والد، علقمہ کے ہمراہ حضرت ابن مسعودؓ کے ہاں گئے۔ اور ان کی خدمت میں ایک مجموعۂ احادیث پیش کیا۔ آپ نے خادمہ کو آواز دی کہ ایک طشت میں پانی لاؤ۔ جب آ گیا۔ تو آپ نے اپنے ہاتھ سے اس مجموعے کو دھو ڈالا اور فرمایا:

اِنّ ھٰذہ القلوب اوعیۃ فاشتغلوھا بالقرآن ولا تشتغلوھا بغیرہٖ	تمھارے دِل برتنوں کی طرح ہیں۔ ان میں قرآن کے سوا کوئی اور چیز مت ڈالو۔

(جامع ص۳۳)

کچھ ہفتے ہوئے آئرلینڈ کے شہرۂ آفاق شاعر برنارڈ شا نے اپنے یوم ولادت پر اپنی دو تین تصانیف پر دستخط کر کے انھیں نیلام کیا۔ اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ وہ دو تین چھوٹی چھوٹی کتابیں دو لاکھ چوبیس ہزار روپے میں فروخت ہوئیں۔ برنارڈ شاہ کی تحریرات کی تو یہ قدر ہو۔ اور رسول کے اقوال کو اُن کے فدائی جہاں پائیں دھو ڈالیں اور یا مٹا دیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ کیا ان لوگوں کو رسولؐ سے محبّت نہیں تھی؟ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ محبّت تو تھی۔ لیکن وہ اقوال، اقوالِ رسولؐ نہیں تھے۔

(۱۴) جریر بن عبد الحمید کہتے ہیں۔ کہ منصور، مغیرہ اور الاعمش جیسے محدثین کتابتِ احادیث کو گناہ سمجھتے تھے۔ (جامع ص۳۲)

(۱۵) قرظہ بن کعب کہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ ہم عراق کو روانہ ہوئے حضرت فاروقؓ مقام حرار تک ساتھ آئے۔ وہاں نماز ادا کی، اور پھر فرمایا کہ دیکھو میں ایک نہایت اہم بات کہنے کے لیے تمہارے ہمراہ یہاں تک آیا ہوں۔ اور وہ یہ کہ عراق کی سرزمین سے تلاوتِ قرآن کی سُریلی آواز یوں اُٹھ رہی ہے جس طرح چھتّے کے ارد گرد شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ خدا کے لیے انھیں احادیث میں پھنسا کر قرآن سے دُور نہ پھینکنا۔

(تذکرۃ الحفّاظ ص ۶، وجامع بیان ص ۱۴۷)

(۱۶) رحلتِ حضورؐ سے صرف تین برس پہلے حضرت ابوہریرۃؓ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ لیکن روایت احادیث میں سب سے بازی لے گئے، اور اسی سلسلے میں ایک مرتبہ پٹے بھی۔ واقعہ یوں ہے کہ آپ رسول اکرم صلعم کے ہاں تشریف لے گئے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ کہ اے ابوہریرہ جا اور ہر اُس شخص کو جنّت کی بشارت دے دے، جس نے زبان سے لآ الٰہ کہہ دیا ہو۔ ابوہریرہ باہر نکلے تو سب سے پہلے حضرت عمرؓ بن خطاب سے ملاقات ہوئی۔ اور یہ بشارت سُنائی حضرت عمرؓ نے ابوہریرہ کی چھاتی پہ ایک گھونسہ کھینچ مارا جس سے وہ زمین پہ گر گئے۔ اور روتی صورت بنائے واپس دربار رسالت میں پہنچے۔ پیچھے پیچھے عمرؓ بھی پہنچ گئے۔ حضورؐ نے پوچھا، کہ اسے کیوں پیٹا ہے؟ کہا کیا آپ نے صرف لآ الٰہ کہنے پہ جنّت کی بشارت دی ہے۔

فرمایا، ہاں۔ عمرؓ نے کہا: ازراہ نوازش ایسا نہ کیجیے، ورنہ لوگ اعمال کو ترک کر دیں گے۔ **فخلهم يعملون** (آپ لوگوں کو کام کرنے دیں) حضورؐ نے فرمایا، بہت اچھا۔ لوگوں کو کہہ دو کہ کام کریں۔ (ملخص)

(صحیح مسلم۔ کتاب الایمان، طبع مجتبائی ص۴۵ مع فتح الملہم)

ملاحظہ کیا آپ نے کتنی دلچسپ حدیث ہے۔ صرف دو لفظ (لا الٰہ) منہ سے نکالو، اور جنت لے لو۔ نہ صوم و صلوٰۃ کی ضرورت، نہ میدان جہاد میں لہو بہانے کی حاجت، نہ صدقہ و زکوٰۃ کے جھمیلے اور نہ جہادِ اکبر و اصغر کے جھگڑے۔ دوسری دلچسپی یہ کہ حضرت فاروقؓ بارگاہ رسالت کو حکم دیتے ہیں **فلا تفعل فخلهم يعملون** آپ لوگوں کو ایسی احادیث نہ سنایا کیجیے۔ مطلب یہ کہ ایسی احادیث سنا کر انھیں خراب نہ کیجیے، اور لوگوں کو کام کرنے دیجیے۔ یعنی مذہب کے معاملے میں حضرت فاروقؓ سرورِ کائنات کی رہنمائی فرما رہے ہیں۔ اور لطف یہ کہ حضورؐ اس حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتے اور فرماتے ہیں **فخلهم** (بہت اچھا لوگوں کو کام کرنے دو) بدیگر الفاظ رسول اکرم صلعم نے اعتراف فرمایا کہ ان کی حدیث (مَن قال لا الٰہ) سے لوگ بے عمل ہو سکتے تھے۔

غور فرمائیے کہ اس حدیث نے حضورؐ پُر نور کی منزلت کو کتنا کم کر دیا۔ کہ اُن کا ایک طفلِ مکتب اُنھیں سیدھا راستہ دکھا رہا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ اس قسم کی احادیث

تراشا کرتے تھے۔ بلکہ یہ ہے کہ یہ لوگ گھڑ کر اُن کا نام جڑ دیتے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود ابو ہریرہؓ بھی روایت میں قدرے غیر محتاط ہوں۔ علّامہ ذہبی نے اُن کا یہ فقرہ نقل کیا ہے۔

قال ابو هريرة لقد حدثتكم باحاديث لو حدثت بها في زمن عمر بن الخطاب لضربني بالدرة۔	حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسی ایسی احادیث بیان کی ہیں کہ اگر عمرؓ بن الخطاب کے زمانے میں روایت کرتا تو وہ مجھے دُرّے سے پیٹ ڈالتے۔

(تذکرۃ الحفاظ ص۷)

کیوں پیٹ ڈالتے؟ سرورِ کائناتؐ کا اسوہ بیان کرنے پر؟ کیا کوئی مسلمان ایسا کر سکتا ہے؟ نہیں، بلکہ مشتبہ احادیث کی روایت پر۔ حضرت عمرؓ اسی لیے تو احادیث جلا دیا کرتے تھے۔ اور بڑے بڑے صحابہ کو اس جرم میں قید و بند کی سزا دیتے تھے۔ جس عمرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو حضورِ پرنور کی زندگی میں پیٹ ڈالا تھا۔ اور جس نے رسول اکرم صلعم کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہہ دیا تھا حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ وہ اپنے عہدِ خلافت میں ابو ہریرہؓ یا کسی اور بزرگ کو روایتِ احادیث کی اجازت کیسے دے سکتا تھا؟ ہمارے علماء فرماتے ہیں۔ کہ حدیث وحی غیر متلو ہے۔ اس پر ایمان لائیے۔ میں اس قسم کے علماء سے صرف ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کہ آپ بڑے مسلمان ہیں یا حضرت عمرؓ؟ اللہ و رسولؐ کی منشا سے وہ زیادہ

باخبر تھے، یا آپ!

حاشا وکلا کہ مجھے حدیث سے بغض نہیں۔ بلکہ اُن انسانی اقوال سے ضد ہے۔ جنھیں یہودیوں، زندیقوں اور ہمارے فرقہ باز رہنماؤں نے تراش کر مہبط الوحی صلعم کی طرف اس لیے منسوب کر دیا تھا۔ کہ خدا، رسول اور قرآن کا کوئی وقار دنیا میں باقی نہ رہے۔

ہمارے موجودہ علماء میں ایک دو بڑی بڑی خوبیاں موجود ہیں۔

اوّل۔ کہ ان کا دامن وضع احادیث کے داغ سے ملوث نہیں۔

دوم۔ انھیں سرورِ کائنات سے گہری محبت ہے۔ اور ایک دو خرابیاں بھی ہیں۔

اوّل۔ کہ ملکۂ تنقید سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے وہ صحیح و غلط میں تمیز نہیں کر سکتے۔ **دوم**۔ وہ اسلاف پرستی اور اندھی تقلید کے امراض میں مبتلا ہیں۔ چونکہ ہمارے بعض اسلاف کہہ بیٹھے ہیں کہ صحیح بخاری کی ہر حدیث صحیح ہے۔ اِس لیے ہمارے علماء بخاری کی کسی حدیث کو ناقدانہ نظر سے دیکھنا یا معیارِ درایت پہ پرکھنا کفر سے کم نہیں سمجھتے۔ شیخ عبد الحق دہلوی کی رائے تھی کہ صحاح میں انسانی اقوال کی آمیزش ہے۔ علامہ ابن حجر کا خیال تھا کہ صحیح بخاری کی چالیس احادیث مشتبہ ہیں (ملاحظہ ہو حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا رسالہ الفرقان شاہ ولی اللہ صفحہ ۲۶۸ و ۲۷۶)

اور شیخ حمید الدین فراہی فرماتے ہیں:

"میں نے صحاح میں بعض ایسی احادیث دیکھیں، جو قرآن کا صفایا کر دیتی ہیں۔ ہم اس عقیدے سے پناہ مانگتے ہیں۔ کہ کلامِ رسول، کلامِ خدا کو منسوخ کر سکتا ہے۔"

(نظام القرآن)

(۱۵) شعیب بن حرب (وفات ۱۹۶ھ) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن سفیان ثوریؒ کے ہاں حدیث کا ذکر چل پڑا تو آپ نے کہا:

لو کان فی ھذا الحدیث خیر لنقص کما ینقص الخیر ولکنہ شر فارا ہ یزید کما یزید الشر۔	اگر حدیث کوئی اچھی چیز ہوتی۔ تو باقی نیکیوں کی طرح یہ بھی گھٹتی جاتی لیکن یہ بڑھ رہی ہے۔ اس لیے یہ ایک بدی ہے۔

(جامع صہ ۱۷۸)

(۱۶) جب سفیان بن عُیینہ سے حدیث کی فرمائش کی گئی تو آپ نے فرمایا:

ما ادری الذی نطلبونہ من الخیر، ولو کان خیراً لنقص کما ینقص الخیر۔	تم جس چیز کی تلاش میں ہو، وہ کوئی نیکی نہیں ہے۔ اگر نیکی ہوتی تو باقی نیکیوں کی طرح کم ہوتی جاتی۔

(جامع صہ ۱۷۸)

(۱۹) بکر بن حماد (دوسری صدی کا ایک شاعر) مضمون بالا کو یوں ادا کرتے ہیں:-

اری الخیر فی الدُنیا یقل کثیرہ	وینقص نقصًا والحدیث یزید
ولو کان خیرا قذن کالخیر کُلہا	فاحسب ان الخیر منہ بعید

میں دیکھ رہا ہوں کہ دنیا میں نیکی کم ہو رہی ہے۔ لیکن حدیث بڑھ رہی ہے۔ اگر حدیث اچھی چیز ہوتی، تو باقی نیکیوں کی طرح یہ بھی گھٹتی جاتی۔ پس میں یہ نتیجہ نکالنے پہ مجبور ہوں کہ حدیث کا نیکی سے کوئی تعلق نہیں

(توجیہ النظر شیخ طاہر بن صالح صفحہ ۱۸۰)

(۲۰) بشران حارث کہتے ہیں کہ میں نے ابو خالد الاحمر الکوفی (وفات ۱۹۲ھ) کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

یاتی علی الناس زمان	ایک ایسا زمانہ بھی آ رہا ہے کہ
تعطل فیہا المصاحف لایقرء	لوگ قرآن شریف کو ایک طرف رکھ
فیہا ویطلبون الحدیث	دیں گے اور احادیث کی تلاش
	میں نکل پڑیں گے۔

(جامع صفحہ ۱۸۰)

اور وہ زمانہ دوسری صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اور اب یہ عالم ہے کہ ساری اُمت، قرآن سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ قوائے عمل پہ اوس پڑ چکی ہے۔ ہر فرد حدیث کی ارزاں جنت کی تلاش میں ہے

سارا زور اوراد و وظائف پہ صرف ہو رہا ہے۔ صرف وضو کرنے پہ گناہوں کی مغفرت ہو رہی ہے۔ چند الفاظ کے وِرد پر زمرّد اور موتیوں کے محل تیار ہو رہے ہیں۔ نماز میں رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہنے پر زندگی کی تمام سیاہ کاریاں دھوئی جا رہی ہیں۔ اور حلوے کا ایک لقمہ کھلانے سے عذابِ قبر ٹل رہا ہے۔ کہیے، کہ اس قدر سستی جنّت کو چھوڑ کر قرآن کے شمشیر و سناں، صبر و ابتلا، خوف و جوع، اور ایثار و شہادت والے اسلام کے قریب کون جاتے ؟ کون عمر بھر کی کمائی قوم کے حوالے کر دے۔ دسمبر کی ٹھنڈی راتوں میں برفانی پہاڑوں پہ کون پہرہ دے۔ طیاروں کی بمباری کون سہے۔ ٹینکوں کے آگے میلوں کون بھاگے۔ اور گولیوں سے سینہ چھلنی کرا کے بہشت کون لے ؟ کیوں نہ مسجد میں گھس کر کچھ وقت کے لیے اللہ اللہ کرے اور مرنے کے بعد سیدھا جنت میں چلا جائے۔

من قال سبحان اللّٰہ و بحمدہٖ فی یوم مائۃ مرّۃ حطت منہ خطایاہ و ان کانت مثل زبد البحر ۔

جو شخص دن میں سو مرتبہ "سبحان اللہ وبحمدہٖ" کا وِرد کرے گا۔ اس کی تمام سیاہ کاریاں معاف ہو جائیں گی خواہ وہ سمندر کی جھاگ سے بھی زیادہ ہوں۔

(موطا امام مالک۔ مطبع مجتبائی طبع ۱۳۴۵ھ صفحہ ۷۳)

موطا کے اسی صفحے پہ ایک اور حدیث دی ہوئی ہے، جو موطا میں موقوف (حضورؐ تک نہیں پہنچی بلکہ کسی صحابی کی رائے ہے) اور ترمذی و ابن ماجہ میں باقاعدہ حضورؐ سے مروی ہے:

عن ابی الدرداء قال الا اخبرکم بخیر اعمالکم وارفعها فی درجاتکم وخیر لکم من اعطاء الذهب والورق وخیر لکم من ان تلقوا عدوکم فتضربوا اعناقکم و یضربوا اعناقهم۔ قالوا بلیٰ۔ قال ذکر اللہ تعالیٰ۔

ابی الدرداء (صحابی) کہتے ہیں۔ آؤ میں تمھیں بتاؤں کہ سب سے بہتر عمل جس سے تمھارے مدارج بہت بلند ہو جائیں، کون سا ہے۔ ایسا عمل جو سونے اور چاندی کی قربانی اور جہاد سے بھی بہتر ہو، وہ جہاد جس میں تم دشمن کا سر کاٹتے ہو اور وہ تمھارا، لوگوں نے کہا فرمایئے! کہا، اللہ کا ذکر۔

(موطا صد ۳۰)

ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ حدیث کی دنیا میں موطا کا درجہ کتنا بلند ہے۔ اِس بلند کتاب میں اس حدیث کو پڑھنے کے بعد کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ ملک، و ملّت کی حفاظت یا اپنی مستورات کی عزّت و عصمت بچانے کے لیے سر دُنیا پھرے۔ وہ غلام رہے یا آزاد اُس کی بلا سے۔ ساری دنیا جنّت کے لیے مرتی ہے۔ اور یہ نعمت اس کو زبانی یادِ خدا سے مل سکتی ہے۔ پھر وہ خواہ مخواہ

دُکھ کیوں اُٹھائیے، اور اپنی لاش کو خاک و خون میں کیوں تڑپائیے۔

(۲۰) وکیعؒ فرماتے ہیں کہ امام داؤد طائی سے کسی نے پوچھا کہ آپ احادیث کی روایت کیوں نہیں کرتے۔ فرمایا:

"مَیں بچّوں کا کھلونا نہیں بننا چاہتا۔"

(جامع صفحہ ۱۸۰)

(۲۱) ایک مرتبہ چند طلبۂ حدیث حضرت فضیل بن عیاضؒ کے ہاں درسِ حدیث لینے کے لیے آئے۔ آپ نے انھیں ان الفاظ میں ڈانٹ پلائی:

اِنکم قد ضیعتم کتاب	تم لوگوں نے اللہ کی کتاب کو ضائع کر دیا ہے
اللّٰہ ولو طلبتم کتاب اللّٰہِ	اگر تم کتابِ الٰہی کی تلاش کرتے تو اس میں
لوجدتم فیہ شفاءً،	تمھیں شفا مل جاتی اور اس کے بعد یہ
ثمّ قرء یآایّھا النّاس قد	آیت پڑھی اے لوگو! تمھارے پاس اللہ کی
جاءتکم موعظۃ منّ	طرف سے ضابطۂ حیات آچکا ہے جس میں
ربّکم و شفاء لما فی	دل و دماغ کی تمام بیماریوں کا علاج درج ہے
الصدور و ھدیً وّ	اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت بھی ہے
رحمۃ للمؤمنین. قل	اور رحمت بھی۔ اے رسولؐ ان مسلمانوں کو
بفضل اللّٰہ وبرحمتہ فبذلک	کہہ دو، کہ وہ اللہ کی اس رحمت اور اس
فلیفرحوا ھو خیرٌ ممّا	نعمت (قرآن) پر خوش ہوں اور یہ قرآن

یجمعون۔ (جامع صہ ۱۸۱) اُس چیز (اس سے مراد حدیث بھی ہو سکتی ہے) سے اچھا ہے جسے وہ جمع کر رہے ہیں۔

تو جو کتاب شفا بھی ہے، موعظت و رحمت بھی، اللہ کا فضل بھی ہے اور نعمت بھی۔ کیا وہ ہدایت کے لیے کافی نہیں؟

(۲۲) اسی طرح ایک دفعہ چند طلبا نے حضرت فضیل بن عیاض کو درسِ حدیث پہ مجبور کیا۔ تو آپ نے فرمایا:

لم تکرھونی علی امرٍ تعلمون انّی کارہٌ لہ

تم مجھے ایک ایسی بات پہ کیوں مجبور کر رہے ہو جس سے مجھے نفرت ہے۔

(جامع صہ ۱۸۱)

(۲۳) سفیان ثوریؒ کا قول ہے:

انا فی الحدیث منذ ستین سنۃ وددتُ انی خرجت منہ کفافاً لا علیّ ولا لی۔ (جامع صہ ۱۸۱)

مَیں گذشتہ ساٹھ برس سے حدیث کی دلدل میں پھنسا ہُوا ہوں۔ اور اب اس سے اس حالت میں نکلنا چاہتا ہوں کہ اس کے فائدے اور نقصان ہر دو سے محفوظ رہوں۔

(۲۴) اُس زمانے میں علمائے اسلام احادیث کی کثرت اور رنگ برنگی سے اس قدر گھبرا اُٹھے تھے کہ یموت بن المزرع کو یہ فقرہ کسنے کی جرأت ہو گئی تھی:

اذا رایت شیخاً یعدوا فاعلم ان اصحاب الحدیث خلفہ	جب تم کسی عالم کو سرپٹ بھاگتا دیکھو تو سمجھ لو کہ طلبۂ حدیث اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔

(جامع ص۱۸۱)

(۲۵) محمد بن سلام حضرت فاروق رضؓ کے اس قول کے راوی ہیں:

ما رایت علماً اشرف ولا اھلاً اخف من اھل الحدیث	میں نے حدیث سے بہتر کوئی علم اور اہلِ حدیث سے زیادہ ذلیل کوئی مخلوق نہیں دیکھی۔

(جامع ص۱۸۱)

مطلب صاف ہے کہ اقوالِ رسولؐ کی عظمت میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان میں انسانی اقوال کی اس قدر آمیزش ہوگئی ہے کہ اس علم کے خزینہ دار بے وقار ہو کر رہ گئے ہیں۔

(۲۶) سفیان بن عیینہ مسعر سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے کہا:

"خدا میرے دشمن کو محدّث بنا دے"۔

ایک اور موقعہ پہ فرمایا:

"کاش علمِ حدیث میرے سر پہ شیشوں کا ایک ٹوکرا ہوتا جو گر کر چور چور ہو جاتا"۔

(۲۷) ایک دفعہ چند طلبۂ حدیث سفیان بن عُیینہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو آپ نے اُنھیں دیکھ کر فرمایا:

انتم سخنۃ عینی — تم میری آنکھوں کی جلن ہو۔

اور ساتھ ہی کہا:

"اگر آج عمرؓ بن خطاب زندہ ہوتے اور ہم سب کو دیکھ پاتے، تو ہمیں سزا دیتے۔"

(جامع صہ ۱۸۲)

(۲۸) ابن ابی عدی کہتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ امام شعبہ نے فرمایا:

"ایک زمانہ تھا کہ میں اصحابِ حدیث سے مل کر خوش ہوتا تھا، لیکن آج لیس شیء ابغض الیّ من ان اریٰ واحداً منھم میرے ہاں سب سے زیادہ قابلِ نفرت یہی لوگ ہیں۔" (جامع صہ ۱۸۲)

(۲۹) یحییٰؒ بن سعید القطان البصری (وفات ۱۹۸ھ) روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ چند طلبہ امام شعبہ کے پاس درسِ حدیث لینے کے لیے آئے۔ آپ نے جھک کر فرمایا:

انّ ھذا الحدیث لیصدکم عن ذکر اللہ فھل انتم منتھون — یہ حدیث تمھیں اللہ کے ذکر سے روکتی ہے۔ کیا تم باز نہیں آؤ گے؟

(جامع صہ ۱۸۲)

(۳۰) سفیان بن الحسینؒ فرماتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ ایاسؒ بن معاویہ سے میری ملاقات ہوئی، تو اُنھوں نے کہا:

اراک تطلب الاحادیث والتفسیر ایاك والشناعة — مَیں دیکھ رہا ہوں کہ تم احادیث اور تفسیری اقوال کی تلاش میں پھر رہے ہو۔ خبردار! اس کثافت سے بچو۔

(جامع صہ ۱۸۳)

(۳۱) ایک مرتبہ امام الاعمشؒ نے طلبۂ حدیث سے کہا:

"مجھے حدیث حنظل سے بھی زیادہ کڑوی معلوم ہو، تم جس شخص کے قریب جاتے ہو، اُسے جھوٹ بولنے (یعنی احادیث پڑھنے) کی ترغیب دیتے ہو۔"

(جامع صہ ۱۸۳)

(۳۲) ابوبکر بن عیاش کہتے ہیں کہ ایک موقعہ پر مغیرۃ العنبی نے اربابِ حدیث کے متعلق فرمایا:

واللہ لانا اشد خوفاً منہم من الفسّاق — خدا کی قسم مَیں بدمعاشوں سے اتنا نہیں گھبراتا، جتنا ان حدیث والوں سے

(جامع صہ ۱۸۳)

(۳۳) سعید القطّان نے اپنے بیٹے کو کہا:

لم تری الصالحین فی شیٔ اکذب منہم فی الحدیث۔ — کہ یہ صوفی وزاہد لوگ احادیث کے معاملے میں سب سے بڑے جھوٹے واقع ہوتے ہیں۔

(فتح الملہم شبیر احمد عثمانی طبع مجتبائی ج ۱۔ صہ ۱۳۲)

(۳۴) امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ تین قسم کی احادیث میں تحریف ہو چکی ہے۔ پیشگوئیاں، جنگیں اور تفسیری احادیث۔ صرف باب التفسیر میں احادیث کی یہ کثرت ہے کہ ابن حنبل کے ایک دوست ابو زرعہ کو ایک لاکھ چالیس ہزار تفسیری احادیث یاد تھیں :: (توجیہہ صفحہ ۱۱ - ۱۸)

دوسرا باب

تدوینِ حدیث

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں. صحابہ کبار جمع احادیث کے خلاف تھے صحابہ کرام میں سے چند بزرگ یعنی انس بن مالکؓ. ابوہریرہؓ اور عبد اللہ بن عمرؓ ایسے نظر آتے ہیں. جن کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں سنن ابی داؤد میں یہ حدیث ملتی ہے۔ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے رسول اکرم صلعم سے دریافت کیا۔ کہ کیا میں آپ کے اقوال لکھ سکتا ہوں، تو حضورؐ نے فرمایا: نعم! انی لا انول الاحقا بیشک لکھ لیا کرو۔ اس لیے کہ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں۔

حیرت ہے کہ جس ہستی نے کتابت حدیث سے منع فرمایا تھا (مسلم) اور جس کے جلیل القدر جانشین آپ کے ارشاد کی تعمیل میں نہ صرف اپنے مجموعے بلکہ ہر صحابی کے مجموعے ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کرتے رہے اُسی ہستی نے عبد اللہ بن عمرؓ کو کتابت کی اجازت کیسے دے دی تھی؟ مزید حیرت اس امر پر. کہ جب حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے احادیث جلانے یا مٹانے کا حکم دیا تھا تو حضرت ابن عمرؓ نے کیوں

تعمیل نہ کی۔ کیا قرآن کی رُو سے اولی الامر کی تعمیل فرض نہیں؟
یا تو ہم یہ تسلیم کریں، کہ صحیح مسلم کی حدیث غلط ہے، اور یا ابن عمرؓ
کو رسولؐ خدا اور خلفاے کرام کی حکم عدولی کا ملزم ٹھہرائیں۔ حضورؐ
کے خلفا کے عمل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحیح مسلم کی حدیث
صحیح ہے۔ اور اگر مسلم کی حدیث کو صحیح قرار دیں، تو ابو داود والی
حدیث وضعی ثابت ہوتی ہے۔

مسند ابن وہب میں حضرت ابو ہریرہؓ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ
احادیث لکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن صحیح بخاری میں خود ابو ہریرہؓ کی
یہ روایت موجود ہے:

ما من اصحاب النبی اکثر حدیثا منّی الا عبد اللہ بن عمرو فانہ کان یکتب وکنتُ لا اکتب۔

تمام صحابہ میں دو عبد اللہ بن عمرو کی روایات مجھ سے زیادہ تھیں، اس لئے کہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہیں لکھا کرتا تھا۔

چونکہ امام بخاری کی صحیح مسند کو رُو سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔
اس لیے مسند کے بیان کو ہم صحیح قرار نہیں دے سکتے۔

حضرت انسؓ کے متعلق روایت ترمذی میں ملتی ہے۔ آپ
سرورِ کائنات صلعم کے خادمِ خاص تھے، اور عمر میں بہت چھوٹے۔
یعنی جب حضورؐ مدینہ میں تشریف لائے تھے، تو حضرت انسؓ کی
عمر صرف ساڑھے نو برس تھی۔ اور رحلت حضورؐ کے وقت دس

بیس برس۔ اپنے ارد گرد نظر ڈال کر دیکھیے، اور اندازہ لگائیے کہ
کیا کوئی لڑکا اٹھارہ انیس برس کی عمر تک کسی قسم کی کوئی ذمہ داری
محسوس کر سکتا ہے؟ حضرت انسؓ کا کام تھا حرم نبوی اور وفاتِ
نبوی کی خدمت۔ دن کا بیشتر حصہ، خرید و فروخت، لین دین،
جھاڑ پھونک میں گذر جاتا تھا۔ کچھ فرصت ملتی تو قرآن شریف یاد
کیا کرتے تھے۔ وہ ارشاداتِ نبویؐ ضرور سنتے ہوں گے۔ لیکن لڑکپن
کا زمانہ تھا، انھیں کیا پڑی تھی کہ ہر ارشاد اور ہر واقعہ تمام جزئیات
کے ساتھ یاد کرتے پھرتے۔ واقعہ سامنے آیا اور گذر گیا۔ کچھ یاد
رہا اور کچھ بھول گیا۔ کوئی بات کان سے ٹکراتی، سُن لی۔ اور پھر کام
میں لگ گئے۔ لیکن جب حضورؐ کی رحلت کے بعد لوگ قرآن کو چھوڑ
کر حدیث کے پیچھے پڑ گئے۔ اور راویان حدیث کی منزلت بڑھ گئی۔
تو آپ نے بھی بھولے بسرے واقعات اور گوش گذشتہ ارشادات
کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ممکن ہے کوئی ارشاد بالفاظہٖ یاد رہا ہو۔
اور بعض دیگر کا خاکہ خود مکمّل کر لیا ہو۔ بہر حال جو احادیث آپ
سے مروی ہیں، ان کی تعداد ۱۲۸۶ ہے۔ جن میں سے ۱۶۸ کی صحت پر
ائمہ حدیث کا اتفاق ہے، اور باقی ۱۱۱۸ کو ناقابلِ توجہ سمجھا
جاتا ہے۔ امام بخاری نے ان متفقہ احادیث میں سے صرف
۸۳ نقل کی ہیں۔ مسلم نے ۷۱ اور باقی کو مشکوک سمجھ کر نظر انداز
کر دیا ہے۔ اتنی کانٹ چھانٹ کے بعد بھی آپ کی بعض احادیث

بدستور محل نظر ہیں۔ مثلاً

"عتبان بن مالک کہتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ میں نے حضورؐ سے التماس کی کہ وہ میرے گھر میں آکر نماز پڑھیں۔ آپؐ نے یہ التجا قبول فرما لی۔ آپ کے ہمراہ چند صحابہ بھی تشریف لائے۔ صحابہ نے منافقین کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ کہنے لگے۔ کتنا اچھا ہو۔ اگر حضورؐ مالک جو دخشم (منافق) کی ہلاکت کی دعا کریں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ کیا وہ کلمہ نہیں پڑھتا؟ صحابہ نے کہا۔ زبان سے تو پڑھتا ہے لیکن اُس کا دل بے ایمان ہے۔ فرمایا: جو شخص کلمہ پڑھتا ہے، وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث عجیب معلوم ہوئی۔ چنانچہ مَیں نے اپنے بیٹے کو کہا، کہ لکھ لے۔ اور اُس نے لکھ لی۔"

(صحیح مسلم کتاب الایمان)

اگر ابن دخشم واقعی منافق تھا۔ اور اتنے صحابہ کی شہادت کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور خود حضورؐ نے بھی اس کی تردید نہیں فرمائی۔ تو پھر اس کی مغفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ منافقین کے متعلق اللہ کا یہ صریح ارشاد موجود ہے:

اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ

اللّٰہُ لَھُم

اے رسول! اگر تو ان منافقین کے لیے ستّر
مرتبہ بھی مغفرت طلب کرے، پھر بھی ہم
ان کی بدکاریوں کو معاف نہیں کریں گے۔

ایک اور آیت ملاحظہ ہو،

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا
نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ
وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ
لَكٰذِبُوْنَ۔

اے رسول! جب یہ منافق تیرے
پاس آتے ہیں تو تیری رسالت کا اقرار
کرتے ہیں (یعنی باقاعدہ کلمہ پڑھتے ہیں)
لیکن اللہ شہادت دیتا ہے کہ وہ جھوٹے
ہیں۔

جھوٹے ان معنوں میں کہ اُن کی زبان اُن کے دل کی ترجمان
نہیں ہوتی، تو جن لوگوں کے کذب و نفاق پہ خود اللہ شہادت
دے رہا ہو۔ اُن کی مغفرت کی اُمید معلوم۔

ایک اور حدیث ملاحظہ ہو۔

انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ کہ آپ کے پاس جبریل آیا۔ آپ کو پکڑا۔ زمین پر گرایا۔ سینہ چیر کر دل نکالا۔ پھر دل کو چیرا اور ایک ٹکڑے کے متعلق کہا۔ کہ یہ شیطان والا حصہ ہے۔ اس حصے کو سونے کے طشت میں آبِ زمزم سے دھویا۔ پھر دوسرے ٹکڑے کے ساتھ جوڑ کر دوبارہ سینہ میں رکھ دیا۔ اور اس زخم کا نشان تا دم آخر باقی رہا۔"

(صحیح مسلم مع فتح الملہم ص ۳۲۳)

یہ حدیث کئی طرح سے مشکوک ہے۔

اوّل۔ جب بچپن میں حضورؐ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، تو حضرت انس کہاں تھے؟ آپ ایک ایسے دلقعے کو بیان کر رہے ہیں، جو آپ کی پیدائش سے قریباً چھتیس برس پہلے ہوا تھا۔ اگر آپ نے یہ واقعہ کسی سے سنا تھا، تو اس کا نام بتانا ضروری تھا۔

دوم۔ دل کے دو حصے ہیں۔ دایاں حصہ خون کو پھیپھڑوں میں بھیجتا ہے، جو وہاں سے صاف ہو کر دل کے بائیں حصے میں داخل ہوتا ہے اور پھر جسم میں چلا جاتا ہے۔ دل ایک پمپ ہے جس کا کام لہو کو پہلے پھیپھڑوں میں بھیجنا اور پھر جسم میں دھکیلنا ہے۔

یہ صرف گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جو ہاتھ اور پاؤں کی طرح لذّت والم کا احساس نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی خیر و شر کا محرّک ہے۔ تمام افکار، جذبات، خیالات اور تصوّرات کا مرکز دماغ ہے۔ خیر و شر کی تحریک یہیں پیدا ہوتی ہے۔ اور ارادے یہیں بندھتے ہیں۔ اگر جبریلؑ کا مقصد منبع شر کو مٹانا تھا تو دماغ کو چیرتا نہ کہ دل کو۔ اس میں کلام نہیں کہ ہمارے صوفیا و شعرا دل ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ جذبات کا مرکز دل ہے۔ لیکن غلط فہمی سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ دماغ کو مجازاً دل کہہ دیں۔ بہرحال آپ دماغ کو دماغ کہیں یا دل، حقیقت یہی ہے کہ خیر و شر کی تمام تحریکات دماغ سے اُبھرتی ہیں۔ اور دماغ کا مسکن کھوپری ہے، نہ کہ سینہ۔ چونکہ اس حدیث کا واضع دل ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا۔ اس لیے اُس نے یہ حدیث گھڑتے وقت قطعاً نہ سوچا کہ جب علم ترقی کر جائے گا تو اُس وقت کے لوگ اس حدیث کو پڑھ کر خدا، رسولؐ اور جبریلؑ کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ یہی کہ حاکم بدہن ہر سہ دل و دماغ کی ساخت اور ان کے اعمال سے ناآشنا تھے۔

گناہ کی دنیا حسین بھی ہے اور لذیذ بھی۔ انسان اسی صورت میں کامل بن سکتا ہے کہ وہ گناہ کی تمام ترغیبات کو جھٹک کر نیکی کی اجاڑ راہوں پر بڑھتا چلے۔ ایک حسین نوجوان کا تیر نگاہ سے بچ جانا،

اُس کا کمال ہے۔ لیکن اگر کوئی پیر صد سالہ یہ کہے کہ میں عورتوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا گناہ کی توہین سمجھتا ہوں، تو لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے۔ اس لیے ہمیں اس رسول پہ ناز ہے، جو بشر ہوتے ہوئے بھی ہر ترغیب، ہر کشش، اور ہر گناہ سے دامن بچا کر نکل گیا تھا۔ نہ اُس رسول پہ کہ جس کا اپریشن کر کے خطا کاری کی استعداد ہی سے محروم کر دیا گیا تھا۔

چہارم۔ اگر اللہ کی تمنا یہی تھی کہ ہر نبی معصوم ہو تو وہ ماں کے پیٹ میں اُن کے دماغ کی ساخت ویسی بنا سکتا تھا کہ گناہ کا ارادہ ہی پیدا نہ ہو سکتا۔ اور بعد میں جبریلؑ سے اپریشن (اور وہ بھی غلط مقام پر) کرانے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔

پنجم۔ یہ زمزم کے پانی سے مرکزِ گناہ کو دھونے کی بھی خوب کہی۔ اگر کوئی شخص بجلی کے تاروں کو پانی سے دھونا شروع کر دے اور کہے کہ میں ان تاروں سے بجلی ختم کر کے رہوں گا، تو آپ اس کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ دل یا دماغ میں نیکی یا گناہ کا صرف ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم دماغ سے بھیجا نکال کر اسے پانی سے دھونا شروع کر دیں۔ اور کہیں کہ آج ارادوں کا تمام مواد ختم کر کے ہی دم لیں گے تو لوگ کیا کہیں گے؟

تو یہ ہے حقیقت حضرت ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عمروؓ اور انس بن مالکؓ کے مجموعہائے حدیث کی۔ صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ آیا۔

تذکروں میں مذکور ہے کہ مغیرہ شعبی اعمش اور قاسم جیسے علمائے
تابعین جمع احادیث کو ناجائز سمجھتے رہے۔ امام ابن شہاب الزہری
المدنی (وفات سنہ ۱۲۴ھ) پہلے محدث ہے۔ جس نے عمر بن عبدالعزیز
کے حکم سے کچھ احادیث جمع کیں۔ آپ کے بعد ابن جریج نے
مکہ میں۔ ابن اسحاق اور مالک نے مدینہ میں۔ ربیع بن صبیح سعد
بن عروبہ اور حماد بن سلمہ نے بصرہ میں سفیان ثوری نے کوفہ میں۔
اوزاعی نے شام میں۔ ہیثم نے واسط میں۔ معمر نے یمن میں
جریر نے رے میں۔ اور ابن مبارک نے خراسان میں یہی کام
شروع کیا۔ لیکن امام مالک کے بغیر باقی سب کے مجموعے ضائع
ہو گئے۔ دوسری صدی کے آخر میں چند اور مجموعے مرتب ہوئے
مثلاً مسند اسد ابن موسیٰ۔ مسند عبیداللہ بن موسیٰ العبسی۔ مسند
مسدد بصری۔ اور مسند نعیم بن الحماد الخزاعی۔ تیسری صدی کے آغاز
میں امام احمد بن حنبل۔ امام بخاری، مسلم اور ابو داؤد وغیرہ تدوین
احادیث کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابن حنبل نے چالیس ہزار احادیث
جمع کیں۔ ان کے راویوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ ان احادیث
کو روایت و درایت کے معیار پر پرکھنے کے لیے وقت نہ نکال سکے امام
بخاری پہلے محقق ہیں۔ جنہوں نے چھ لاکھ احادیث (امام بخاری تک صرف
چھ لاکھ پہنچی تھیں۔ ورنہ یحییٰ بن معین کو ۱۴ لاکھ احادیث کا علم تھا) میں سے
صحیح احادیث انتخاب کرنے کے لیے انتہائی کوشش کی بعض اوقات

ایک ایک حدیث کے لیے کئی کئی استخارے کیے۔ یعنی جو کچھ انسانی طاقت میں تھا۔ اُنھوں نے کیا۔ لیکن جن احادیث کو مشتبہ سمجھ کر فاروق رضؓ و صدیق رضؓ جلا رہے تھے، وہ اڑھائی سو برس بعد کیسے صحیح بن سکتی تھیں۔ پھر اس عرصے میں ہزاروں جعلساز پیدا ہو چکے تھے۔ جن کا پیشہ ہی حدیث تراشی تھا۔ علامہ محمد طاہر گجراتی نے اپنی مشہور تصنیف " قانون الاخبار الموضوعۃ والرجال الضعفاء" میں قریباً دو ہزار ایسے اشخاص کے نام دیے ہیں جو زندگی بھر جھوٹی احادیث گھڑتے رہے۔ کسی نے ہزار تراشیں اور کسی نے دس ہزار۔ موضوعات کبیر میں ملّا علی قاری لکھتے ہیں کہ ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم نے دس ہزار احادیث وضع کی تھیں۔ جب ابن ابی العوجا زندیق گرفتار ہوا۔ تو اُس نے اقرار کیا کہ میں چار ہزار احادیث گھڑ چکا ہوں۔ جب خلیفۂ وقت نے دریافت کیا کہ وضع حدیث سے تمھارا مقصد کیا تھا۔ تو کہا کچھ نہیں۔ صرف قرآن کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتا رہا۔ بالکل درست کہا تھا۔ ابن ابی العواجا نے عام احادیث کو تو جانے دیجیے۔ صحاح ستہ میں بعض ایسی احادیث راہ پا چکی ہیں۔ جو نہ صرف قرآن سے متصادم ہوتی ہیں۔ بلکہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند علم، عظیم المرتبت شخصیت اور بے مثال کردار کے سخت منافی ہیں۔ تفصیل آگے آئے گی۔ اسی بنا پر مولانا عبید اللہ سندھی رحؒ نے فرمایا تھا:-

"میں ایک یورپین نومسلم کو کتاب بخاری کیوں نہیں پڑھا سکتا؟ اس کی وجہ میں مجلس عام میں نہیں بتا سکتا۔"

(الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر صفحہ ۲۸۵)

یہ نہ سمجھیے کہ احادیث تراشی کا کام صرف یہود، منافق، اور زنادقہ ہی کیا کرتے تھے۔ بلکہ بڑے بڑے قضاۃ بھی اس "کارِخیر" میں شامل تھے۔ مثلاً ابراہیم ابی یحییٰ مدینہ میں۔ الواقدی بغداد میں۔ اور مقاتل بن سلیمان خراسان میں بیٹھ کر احادیث گھڑا کرتے تھے۔ علامہ ابن جوزی نے وضاعین کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ جس میں قاضی وہب بن وہب۔ محمد بن سعید الشامی ابو داؤد النخعی۔ غیاث بن ابراہیم النخعی۔ مغیرہ بن سعید کوفی۔ احمد بن عبد اللہ جوبیاری۔ مامون بن احمد الہروی۔ محمد بن قاسم طالقانی اور محمد بن زیاد الیشکری جیسے "بزرگانِ قوم" شامل ہیں۔

(تذکرۃ الموضوعات۔ علامہ محمد طاہر صفحہ ۹)

جمال الدین المزنی فرماتے ہیں کہ قاضی ابو نصر بن دوعان کی تمام احادیث جھوٹی ہیں۔

(الوجیز و تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۹)

علامہ محمد طاہر کہتے ہیں۔ کہ ابن ابی الدنیا۔ ابی نسطور الرومی۔ بشر۔ نعیم بن سالم۔ خراش۔ دینار۔ ابان بن سفیان۔ ابراہیم بن اسمٰعیل

ابراہیم بن بطار الخوارزمی۔ ابان بن نہشل۔ ابراہیم بن رستم اور اسی قماش کے کئی ہزار بزرگ جھوٹی احادیث تراشا کرتے تھے۔

امام سیوطی اپنی مشہور کتاب لآلی میں لکھتے ہیں کہ ابان بن جعفر البصری نے تین سو احادیث وضع کرکے امام ابو حنیفہ کا نام جڑ دیا تھا۔ الوجیز میں المزنی کہتے ہیں۔ کہ حضور کا مشہور خطبہ جو خطبۃ الوداع کے نام سے مشہور رہے۔ تمام تر جعلی ہے۔ اور اس کا واضع میسرہ بن عبدربہ ہے۔ علامہ دیلمی فرماتے ہیں۔ کہ ابو الفضل جعفر بن محمد بن علی الحسینی کی کتاب العروس خرافات کا ایک پلندہ ہے۔ اور اس کی سب احادیث جھوٹی ہیں۔

(تذکرۃ الموضوعات صـ۱)

علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ احمد بن اسحاق بن ابراہیم بن بلیط بن شرابط کا مجموعۂ احادیث مجموعۂ خرافات ہے۔

(تذکرۃ الموضوعات صـ۱)

معرفۃ علوم الحدیث (صفحہ ۶۰) میں مذکور ہے، ابان نے جعلی احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ اور ہر روایت میں حضرت انس بن مالک کا نام جڑ دیا تھا۔ مقام تعجب نہیں، اگر حضرت انس کی وہ سینہ چیرنے والی حدیث بھی اسی قسم کے مجموعے سے نکل کر صحیح مسلم میں جا پہنچی ہو۔ علامہ ابو الخیر شمس الدین السخاوی مقاصد میں لکھتے ہیں۔

"تفسیری احادیث کے دو مجموعے تیار ہو چکے ہیں۔ ایک کلبی کا، اور دوسرا مقاتل بن سلیمان کا۔ کلبی کے متعلق احمد بن حنبل نے لکھا ہے کہ اس کی ایک بھی حدیث صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض مفسرین اپنے عقائد کے مطابق احادیث گھڑتے رہے۔ جن میں عبدالرحمان بن کیسان الاصم۔ الجبائی الرمانی۔ زمخشری (صاحب کشاف) ابی عبدالرحمان السلمی، الثعلبی، اور الواحدی، خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے نہایت دور از کار مطالب بیان کیے۔ اور ایسی احادیث وضع کیں کہ عقل سر پیٹ کے رہ جاتی۔ مثلاً ایک مفسر مرج البحرین یلتقیان (دنیا کے دو سمندر آپس میں مل رہے ہیں) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ بحرین (دو سمندر) سے مراد حضرت علیؓ اور فاطمہؓ ہیں۔ اور یخرج منهما اللؤلؤ والمرجان (ان سمندروں سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں) میں لولو و مرجان سے مراد حسینؓ و حسنؓ ہیں۔"

(مقاصد و تذکرۃ الموضوعات، ص ۸۲)

ملاحظہ کیا آپ نے کہ وضع احادیث میں کیسے کیسے بزرگوں کی "دعا و ہمت" شامل تھی۔ منافقوں۔ یہودیوں اور دشمنانِ اسلام کا تو ذکر ہی نہ کیجیے کہ ان کا تو مقصد ہی اسلام کے چشمۂ مصفا کو

تکدر کرنا تھا۔ بات کیجیے اپنے بڑے بڑے جبہ پوش قاضیوں کی اور حضرِ صورت واعظوں کی، کہ نہ اللہ سے ڈرے، نہ رسولؐ سے شرمائے۔ نہ نقصانِ مایہ کی فکر کی نہ شماتتِ ہمسایہ کا خیال آیا۔ اور چودہ لاکھ احادیث کا طومارِ عظیم تراش کر ملت کے سر پہ دے مارا۔ اور کہا کہ یہ ہے تمہارا لائحہ عمل۔ قرآن وحی جلی تھا، اور یہ وحی خفی۔ قرآن مجمل تھا، اور یہ مفصّل۔ خاکم بدہن۔ قرآن ناقص تھا (کہ اس میں ادائے صلوٰۃ کا طریقہ درج نہیں) اور یہ مکمل۔ اِس لیے اسے اپنانا ہی پڑے گا۔

زندگی کی چند روزہ وجاہت، اور چند ٹکوں کی خاطر ان لوگوں نے تعلیمِ اسلام کا ستیا ناس کر ڈالا۔ اور اللہ کے انقلاب انگیز، حیات آفرین اور سکون بخش پیغام میں وہ وہ اباطیل و خرافات داخل کر دیے گئے کہ الامان والحذر۔ ملت کی ذہنیت مسخ ہو گئی۔ تصوراتِ حیات بدل گئے۔ اور حقائق نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ وہ مسلمان جو سطحِ ارضی پہ جہانگیر اخوت کی بنیاد ڈالنے آیا تھا، وہ خود ایک تنگ و تاریک حجرے میں مقید ہو گیا۔ وہ جس نے ساحل سے اُچھل کر بیکراں بننا تھا، ایک جوئے کثیف بن کر رہ گیا۔ وہ جس کے خرامِ ناز کا تماشہ تمام عالم نے دیکھنا تھا، گامِ اوّل ہی پہ منزل سمجھ کر بیٹھ گیا۔ وہ جس نے نسلِ آدم کو اوہام و اباطیل کی بندش سے نکالنا تھا۔ خود سب سے

بڑا پرستار او ہام بن کر رہ گیا۔ اور وہ جس نے ظواہر و مناسک کے تمام بُت توڑنے تھے، ہزاروں بُت تراش کر خود ان کی پرستش میں محو ہو گیا۔ درست فرمایا تھا، حکیم الامت نے

تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی بہ امت روایات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

(اقبالؒ)

تیسرا باب

چند عجیب راوی و صحابہ

مبالغہ پسندی، بیجا مدح سرائی، داستان میں ڈرامائی رنگ بھرنا اور خلافِ عقل و عادت باتیں لکھنا، ایشیائی سوانح نگاروں کا امتیازی وصف ہے۔ اور مسلمانوں میں یہ بیماری بہت زیادہ پائی جاتی ہے یقین نہ آئے تو اٹھا کر دیکھو شاہنامہ فردوسی میں ہفتخوانِ رستم، اور اپنے ہزاروں ائمہ و صوفیا کے سوانح حیات۔ مسلم سوانح نگار کو جب تک اپنے ممدوح کے متعلق کوئی خلافِ عقل و عادت واقعہ نہ ملے۔ وہ اپنی تصنیف کو نامکمل سمجھتا ہے۔ یہی حضرات جب احادیث تراشی کی طرف متوجہ ہوتے۔ تو وہاں بھی وہی ڈرامائی رنگ پیدا کر دیا۔ اُسی رسولؐ کی زبان سے قرآن نکلا تھا، جس میں از اوّل تا آخر نہ مبالغہ ہے، نہ کوئی خلافِ عقل بات۔ نہ حقیقت سے تجاوز ہے، نہ ڈرامائی رنگ۔ لیکن جب ہمارے کم سواد و کم نظر لوگ احادیث گھڑنے بیٹھے۔ نہ رسولؐ کے ننگ کلام کو سامنے رکھا، نہ اُن کی شخصیت کا پاس کیا، نہ قرآن کی حقیقت نگاری کا خیال کیا۔ اور جو اناپ شناپ

منہ میں آیا، اُسے معلّم کائنات کی طرف منسوب کر دیا۔ ہر مصنّف کا ایک خاص اندازِ تحریر ہوتا ہے۔ جس سے اُس کی شخصیت جھانک رہی ہوتی ہے۔ آپ غالبؔ کا کوئی کتنا ہی غیر معروف شعر پڑھیں غالب داں مضمون اور تراکیب کو دیکھ کر فوراً تاڑ جائیں گے، کہ یہ شعر غالب کا ہے۔ یہی حال ٹیگور، اقبال اور شیکسپیئر کا ہے۔ کہ وہ اپنے اندازِ بیان۔ اسلوبِ تحریر۔ مخصوص تراکیب اور خاص فلسفے کی وجہ سے فوراً پہچانے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی احمق استاد امام دین گجراتی کے ان اشعار

کوئی سیٹ جنّت میں خالی نہیں ہے
خوشی سے جہنم میں وڑ ما م دینا
قبض کی شکایت اگر تم کو ہووے
تو کھا مولیاں اور مٹر ما م دینا

کو اقبالؔ و غالبؔ کی طرف منسوب کرتا پھرے تو کون تسلیم کرے گا؟ ہمارے حدیث سازوں نے نہ رسولؐ کو سمجھا، نہ اُن کے اندازِ بیان کا جائزہ لیا، نہ اُن کے بلند پیغام، عظیم المرتبت شخصیت مخصوص فلسفۂ حیات اور جہانگیر تعلیم کا خیال کیا اور ہر رطب و یابس اُن کی طرف منسوب کرتے چلے گئے۔ یوں تو حدیث میں اس کی دو نہیں چار نہیں، بلکہ لاکھوں مثالیں موجود ہیں۔ لیکن یہاں صرف ایک دو مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من اغتسل من الجنابۃ حلالاً اعطاہ اللّٰہ مائۃ قصر من درۃ بیضاء وکتب اللّٰہ لہٗ بکل قطرۃ ثواب الف شہید۔

رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت کرنے کے بعد نہاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہشت میں اس کے لیے سفید موتیوں کے ایک سو محل تیار کر دیتا ہے اور پانی کے جتنے قطرے اس کے جسم سے ٹپکتے ہیں۔ ہر قطرے پہ اُسے ایک ہزار شہید کا اجر ملتا ہے۔

دیکھا آپ نے کہ اس شخص کے ہاں مجامعت کتنا بہشت آفریں اور محل ساز عمل ہے؟ اور یہ بھی ملاحظہ کیا کہ اس حدیث میں ڈرامائی رنگ بھرنے کے لیے یہ شخص کہاں پہنچا؟ کہاں سے موتی لیے؟ اور کس سرزمین میں محل جا بنایا۔ اور پھر جان سپاری و سرفروشی جیسے بلند عمل یعنی شہادت کا کیا مضحکہ اُڑایا؟

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

ملّا علی قاری موضوعاتِ کبیر میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین بغداد کے ایک محلہ رصافہ میں صلوٰۃ جمعہ ادا کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ خطیب نے دورانِ وعظ میں مندرجہ ذیل حدیث بیان کی۔

"میں نے احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے سُنا۔ انھوں نے معمر

سے، معمر نے قتادہ سے ۔ قتادہ نے انسؓ سے اور انسؓ نے رسول اکرم صلعم سے ۔ کہ جب کوئی شخص کلمہ پڑھتا ہے، تو ہر لفظ پر ایک پرندہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ جس کے پر زمرد کے ، اور چونچ سونے کی ہوتی ہے . . . . . . " الخ

وعظ کے بعد ان بزرگوں نے خطیب سے پوچھا کہ یہ حدیث تم نے کس سے سنی ہے ۔ کہا احمد بن حنبل اور یحییٰ سے ۔ بولے وہ تو ہم ہیں ۔ ہم نے قطعاً کوئی حدیث بیان نہیں کی ۔ خطیب کہنے لگا اس وقت دنیائے اسلام میں سترہ احمد بن حنبل اور سترہ یحییٰ بن معین موجود ہیں ۔ تم کس باغ کی مولی ہو ۔ یہ ہر دو بزرگ اس ملّا کی دیدۂ دلیری و بے حیائی پر لعنت بھیجتے ہوئے واپس چلے گئے ۔

یہ تو تھا ان کی احادیث کا رنگ ۔ اب ذرا سوانح میں ان کی "حقیقت نگاری" کا نمونہ ملاحظہ کیجیے ۔

(۱) قیس بن تمیم گیلانی چھٹی صدی ہجری کے راوی تھے ۔ آپ کی پیشانی پہ ایک داغ تھا ۔ جس کے متعلق ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کے خچر نے آپ کی پیشانی پہ لات رسید کی تھی ۔

(توجیہہ)

مطلب یہ کہ آپ سوا پانچ سو برس پہلے بھی موجود تھے ۔

(۲) اسحاق بن ابراہیم طوسی کہتا ہے کہ میں ہندوستان گیا ۔ وہاں قنوج میں ہندوستان کے بادشاہ سرباتک سے ملا ۔ اس کی عمر اس

وقت سات سو ستر برس تھی۔ یہ وہی بادشاہ ہے، جس کے پاس رسول اللہ صلعم نے حضرت اسامہ اور حضرت حذیفہ کو تبلیغ کے لیے بھیجا تھا۔ اور وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ (ذہبی۔ علامہ ذہبی: تذکرۃ الموضوعات ۱۰۴)

اسحاق بن ابراہیم غالباً علامہ ذہبی (۶۷۳ھ۔۷۴۸ھ / ۱۲۷۵ء۔۱۳۸۲ء) کا ہمعصر تھا۔ آٹھویں صدی کے آغاز میں ہندوستان آیا ہو گا۔ حیرت ہے کہ رسول اللہ کا ایک صحابی ساڑھے سات سو برس سے زندہ تھا۔ اور کسی ہندوستانی مسلم کو یہ خیال نہ آیا کہ ایسی بزرگ ہستی کی زیارت ہی کر لیں۔ اور تذکروں میں اُن کے واقعات محفوظ کر لیں۔ محمود غزنوی نے ۴۰۹ھ ۱۰۱۸ء میں قنوج فتح کیا تھا۔ اگر وہاں کوئی صحابی بادشاہ حکمران ہوتا تو وہ حملہ ہی کیوں کرتا۔ اگر غلط فہمی میں حملہ کر بیٹھا تھا تو معافی مانگتا اور اپنے دربار کے سینکڑوں مصنفین و شعرا سے کہتا۔ کہ اس مقدس ہستی کے حالات نظم و نثر ہر دو میں قلمبند کرو۔ اگر بالفرض غزنوی سے بھول ہو گئی تھی، تو سلاطین غوری اس فرض کو سرانجام دیتے ۱۲۰۶ء سے ۱۲۸۷ء تک خاندانِ غلامان برسرِ اقتدار رہا۔ اگر کوئی ایسا صحابی موجود ہوتا، تو اس دور کے تذکروں میں اُس کا نام آجاتا۔

مزید براں ایک بادشاہ کا ہندوستان سے چل کر مدینہ جانا اور پھر مشرف بہ اسلام ہونا اتنا اہم واقعہ تھا کہ اگر یہ درست ہوتا تو نجاشی اور ہرقل کے معمولی سے اسلامی رجحان کو اچھالنے والے صحابہ ہزار ہا روایات میں اس کا ذکر کرتے۔ چونکہ اس کا کہیں ذکر موجود نہیں۔ اس لیے یہ واقعہ صریحاً

غلط اور ہمارے تذکرہ نگاروں کے ڈرامائی اندازِ بیان کا ایک نمونہ ہے
بحمد اللہ کہ اسلام میں کچھ محققین بھی ہو گذرے تھے۔ جنھوں نے ایسے
تمام واقعات پر سخت تنقید کی ہے فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔
(۳) ابو سعید مظفر بن اسد کہتا ہے، کہ میں شاہ ہند سرباتک سے ملا۔
اور اس نے مجھے بتایا کہ میں تین مرتبہ آنحضرت صلعم سے ملا تھا۔ دو دفعہ
مکہ میں اور ایک مرتبہ مدینہ میں۔ سرباتک کی وفات ۳۳۳ھ ۹۴۵ء
میں ہوئی تھی۔ اور اُس کی عمر ۸۹۴ برس تھی۔
(تذکرۃ الموضوعات صـ۱۰۲)

حیرت ہے کہ جب اسحاق بن ابراہیم ۳۰۰ھ کے قریب سرباتک سے
ملاقی ہوا تھا، تو اس کی عمر سات سو ستر برس تھی۔ اور ۳۳۳ھ میں یعنی
۳۶۸ برس پہلے اُس کی عمر ۸۹۴ سال تھی۔ ریاضی کے ان "محدثانہ
نکات" کو ہم جیسے بے علم کیا سمجھیں۔
(۴) علامہ ابن الحجر العسقلانی "لسان المیزان" میں مندرجہ ذیل داستان
نقل فرماتے ہیں:۔
"کہتے ہیں کہ ۵۳۷ھ میں امیر عبد الکریم بن نصر کسی جنگل میں شکار
کے لیے گئے۔ اور پھرتے پھراتے ایک گاؤں میں جا پہنچے جس
کے تمام باشندے اپنے آپ کو جبیر بن حرب کی اولاد
بتلاتے تھے۔ اور لطف یہ کہ جبیر بدستور زندہ تھا اور کہتا تھا
کہ میں حضورؐ کے ساتھ جنگِ خندق میں شامل ہوا تھا۔"

کجا جنگِ خندق (۵ھ) اور کجا ۵۷۳ھ۔ صرف ۵۶۸ برس کا فرق ہے۔ حیرت ہے کہ جس جبیر کے حالاتِ زندگی اِس "نقادانہ صحت" کے ساتھ قلمبند ہوتے ہیں، وہ بھی ہمارے راویوں میں شمار ہوتا ہے؟

(۵) ابن حجر فرماتے ہیں۔ کہ میں ایک شخص ابوعبداللہ محمد الصقلی سے ملا۔ جس نے مجھے بتایا کہ میرے اُستاد کو حضرت علیؓ سے مصافحہ کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور کہ اس کی عمر چار سو برس سے کچھ زیادہ تھی"۔
(تذکرۃ الموضوعات صـ۱۰۷)

ابن حجر کا سال وفات ۸۵۲ھ ہے اور حضرت علیؓ کا سنہ ۴۰ھ۔ اگر سال مصافحہ سنہ ۴۰ھ ہی فرض کر لیا جائے تو بھی الصقلی کا اُستاد سنہ ۴۴۰ھ کے قریب فوت ہوگیا ہوگا۔ تعجب ہے کہ شاگرد صاحب ابن حجر کو یہ واقعہ سنانے کے لیے نویں صدی ہجری تک جیتے رہے؟

(۶) جعفر بن نسطور سنہ ۳۴۰ھ میں فوت ہوا تھا۔ لیکن صحابی ہونے کا اسے بھی دعویٰ تھا۔

(۷) علامہ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں۔ کہ بابا رتن ہندی کی وفات ۶۳۲ھ = ۱۲۳۸ء میں ہوئی تھی۔ لیکن محدثین کی ایک خاص تعداد اسے صحابی سمجھ کر اس کی احادیث روایت کرتی ہے۔ جب علامہ ذہبی نے بابا رتن کی روایات کو جھوٹا قرار دیا، تو قاموس کے مصنف علامہ مجدالدین فیروز آبادی (وفات ۸۱۴ھ) کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ انھوں نے علامہ ذہبی سے تمام تعلقات توڑ لیے۔

بابا رتن تین سو احادیث کے راوی ہیں۔ جن میں سے دو تین یہاں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) کنّا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم تحت شجرۃ ایام الخریف فھبت الریح فتناثر الورق فقال النبی ان المومن اذا صلی الفریضۃ فی الجماعۃ تناثر عنہ الذنوب کما تناثر ھٰذا الورق

بابا رتن کہتے ہیں کہ "ہم حضورؐ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ پت جھڑ کا موسم تھا۔ ہوا چلی اور درخت کے پتے جھڑنے لگے تو حضورؐ نے فرمایا کہ جب ایک مومن جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے، تو اس کے گناہ بھی اسی طرح جھڑ جاتے ہیں۔

(۲) من اکرم غنیاً لغناہ و اھان فقیراً لفقرہ لم یزل فی لعنۃ اللہ

جو شخص کسی امیر کی اس لیے عزت کرتا ہے کہ اس کے پاس دولت ہے اور فقیر کو اس لیے حقیر سمجھتا ہے کہ وہ مفلس ہے اُس پر قیامت تک لعنت برستی رہے گی۔

(۳) من مات علی بغض آل محمدٍ مات کافراً۔

جو شخص اولادِ رسولؐ کے بغض میں مر گیا، وہ کافر ہو کے مرا۔

بابا رتن کی احادیث بیشک جھوٹی ہیں۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مضمون اور الفاظ کے لحاظ سے اس کی احادیث اُن احادیث سے بہت بلند ہیں جو اسلامی "غلاموں" نے وضع کی تھیں۔ بابا رتن ایک پیمبر کا صحیح مقام سمجھتا تھا۔ اس لیے اس نے اس مقام کے مطابق احادیث

تراشیں۔

امام ذہبی کا خیال یہ ہے کہ بابا رتن کی تمام روایات موسیٰ بن محلی بن نبدرا نے ۷۰۰ھ کے قریب وضع کی تھیں۔ سال مذکور سے پہلے یہ روایات کہیں بھی موجود نہیں تھیں۔ بابا رتن سے کئی حضرات نے روایت کی ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ موسیٰ بن محلی نے اسے رتن بن نصر بن کربال الہندی کے نام سے یاد کیا ہے۔ زبید بن میکائیل نے اسے رتن بن مهادیو بن باسندیوا بنا دیا۔ داؤد بن اسعد نے اسے رتن بن بدن بن نبدی الصراف السندھی قرار دیا۔ اور ابوبکر المقدسی اسے رتن بن عبداللہ بنایا ہے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ کہ ابوالطفیل عامر بن واثلہ آخری صحابی تھا۔ جس کی وفات ۱۰۲ھ میں مکہ ومکرمہ میں ہوئی تھی (جامع الصحاح) اس لیے جبیر اور رتن وغیرہ کے افسانے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے :

چوتھا باب

کچھ ائمۂ حدیث اور معتبر راویوں کے متعلق

ائمہ حدیث میں ایسے بزرگ بھی پائے جاتے ہیں، جن پر ملّتِ اسلامیہ کو ہمیشہ ناز رہا ہے۔ ان کا علمی مقام اتنا بلند اور اُن کے ثقافتی کارنامے اتنے عظیم ہیں۔ کہ ہمیں اُن پر تنقید کی جرأت ہی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے ہم یہاں صرف اتنا ہی بتائیں گے کہ ایک امام کی رائے دوسرے امام یا راوی کے متعلق کیا تھی؟

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں:

(۱) علی بن مسہر نے سنا ہشام بن عروہ سے۔ اُس نے اپنے والد سے۔ کہ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں:

ما علم انس بن مالك وابو سعید الخدری بحدیث رسول اللہ صلعم وانما کانا غلامین صغیرین۔	حضرت انسؓ اور حضرت ابوسعید الخدری حدیث رسولؐ سے محض ناواقف ہیں اسلیے کہ وہ رسول اللہ صلعم کی زندگی میں چھوٹے چھوٹے لڑکے تھے۔ (جامع بیان العلم صہ ۱۹۷)

(٢) حجاز میں تابعین کے بڑے بڑے محدثین تھے۔ عطاؒ طاؤسؒ اور مجاہدؒ۔ طاؤسؒ کہتا ہے کہ ایک دن میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہ ایک آدمی نے وتر کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث پڑھی۔ ابن عمروؓ نے فرمایا: کذب ابوھریرۃؓ (ابوہریرہؓ جھوٹا ہے)۔ (جامع ص١٩٧)

یہ نہ بھولیے گا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث پانچ ہزار سے کم نہیں۔

(٣) جب حضرت عائشہؓ کے سامنے حضرت عبداللہ بن عمر کی یہ حدیث پڑھی گئی:

صلوٰۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ و اذا خشیت الصبح فواحدۃ۔ — رات کی نماز دو رکعت ہے اور جب صبح قریب آ جائے تو ایک رکعت (یعنی وتر) ادا کرو۔

تو آپ نے فرمایا، کذب ابن عمر، ابن عمر جھوٹا ہے۔
(جامع ص١٩٧)

(٤) جب حضرت عمرؓ بن خطاب کی یہ حدیث:

انّ المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ — کہ میت پہ رونے سے میت کو سزا ملتی ہے۔

حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ اللہ، عمرؓ پہ رحم کرے۔ کیا اس نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی:

لَاتَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزرَ اُخرٰی۔ کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا (بخاری، مسلم)

مسلم نے یہ حدیث چھ مرتبہ چھ اصحابہ سے روایت کی ہے۔ یعنی مغیرہ بن شعبہ رضؓ، نافع بن عبد اللہ رضؓ، عمر بن خطاب رضؓ، عبد اللہ ابن عمر رضؓ، ابو موسیٰ رضؓ اور انس بن مالک رضؓ سے۔ حضرت عائشہ رضؓ نے گویا سب کی تردید فرمادی۔

(۵) اسی طرح جب حضرت عائشہ رضؓ کے سامنے ابن عمر رضؓ کی یہ حدیث بیان کی گئی،

اطلع النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی اھل القلیب فقال ھل وجدتم ما وعد ربکم حقا، فقیل لہ اتدعوا امواتًا فقال ما انتم باسمع منھم ولکن لا یجیبون۔

حضور نے مقتولین جنگ کی لاشوں کو جو ایک گڑھے میں پڑی تھیں، دیکھ کر فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے وہ مواعید پورے کر دیئے ہیں، جو تم سے کیے گئے تھے؟ کسی نے کہا آپ مُردوں کو پکار رہے ہیں؟ فرمایا: تم اُن سے زیادہ نہیں سن سکتے۔ فرق یہ ہے کہ وہ جواب نہیں دے سکتے

تو آپ نے کہا حضور نے اُن لاشوں کو دیکھ کر صرف اتنا فرمایا تھا:

انھم لیعلمون الاٰن ان ما کنت اقول حق۔ ان لوگوں کو اب معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ میں کہا کرتا تھا، وہ درست تھا۔

اور پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی:

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى   تم مُردوں کو کوئی بات نہیں سُنا سکتے۔

(صحیح بخاری باب ما جاء فی عذاب القبر)

حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ تھا۔ کہ ابن عمرؓ کی یہ روایت قرآن سے متصادم ہوتی ہے۔ اِس لیے یہ درست نہیں۔

(۶) عروہ بن زبیر مدنی (وفات ۹۴ھ) سے کسی نے کہا۔ کہ بقول ابن عباسؓ رسول کریم صلعم نبوّت کے بعد تیرہ برس مکّہ میں رہے تھے، تو عروہ بولے ابن عباسؓ جھوٹ کہتا ہے (جامع ص ۱۹۷)

(۷) حضرت امام حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالبؓ سے کسی نے وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُودٍ کی تفسیر پوچھی۔ جب آپ بیان کر چکے، تو سائل نے کہا۔ کہ ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ کی تفسیر کچھ اور ہے۔ فرمایا قد کذبا۔ ان دونوں نے جھوٹ بولا ہے۔ (جامع ص ۱۹۷)

(۸) حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مغیرہ بن شعبہ۔ عبادہ بن الصامت اور ابو محمد مسعود بن اوس انصاری بدری کی سب روایات جھوٹی ہیں۔
(جامع ص ۱۹۸)

(۹) محمد بن جُبیر بن مطعم کہتے ہیں۔ کہ میں نے امیر معاویہ کو عبداللہ بن عمرؓ کی ایک حدیث سنائی۔ جس پر معاویہ کو سخت غصہ آیا اور لوگوں کو جمع کر کے کہا:

بلغنی ان رجالاً منکم   مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ
یتحدثون احادیث لیست   ایسی احادیث بیان کر رہے ہیں جو نہ

فی کتاب اللہ ولا نوثر عن رسول اللہ صلعم۔ فاولٓئک جہالکم فایاکم والامانی التی تضل اھلھا۔	رسول اللہ صلعم سے منقول ہیں اور نہ تعلیماتِ قرآن کے مطابق۔ یہ لوگ جاہل ہیں۔ تم گمراہ کن آرزوؤں سے دُور رہو۔

(صحیح بخاری۔ ج ۲۔ صہ ۱۱۷۱)

اِس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے زمانے ہی ہیں احادیث کا چشمہ مکدر ہو چکا تھا۔ اقوالِ رسول کو مسخ کیا جا رہا تھا اور اہلِ نظر صحابہ کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ ورنہ امیر معاویہؓ، ابن عمروؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو جاہل کیوں کہتے؟

اِس حدیث میں " انّ رجالاً منکم" کے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ میں کافی تعداد ایسے حضرات کی موجود تھی، جو محرّف احادیث بیان کرنے کے خوگر تھے۔ ورنہ معاویہ رجالاً (کئی اشخاص) کی جگہ رجلاً (ایک آدمی) کا لفظ استعمال کرتے۔

(۱۰) جب سمرہ کی یہ حدیث،

کانت للنبی سکتتان عند قرأتہ فی الصلاۃ	حضورؐ قرأتِ نماز میں دو مرتبہ سکتہ (ٹھہرنا، وقفہ کرنا) فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عمران بن الحصینؓ (وفات ۵۲ھ) نے سنی تو کہا۔ کذب سمرۃ سمرہ جھوٹا ہے۔

(کتاب الانتفاع بجلود المیتۃ للمروزی و جامع صہ ۱۹۷)

یہ تو تھے صحابہ کرام ۔ اب ذرا نیچے آیئے اور دیکھیے کہ بڑے بڑے ائمۂ حدیث ایک دوسرے کو کیا سمجھتے تھے ۔

حضرت امام مالک بن انس کے متعلق محمد بن اسحاق کہا کرتے تھے کہ وہ جھوٹا ہے ۔ اور امام مالک فرمایا کرتے کہ ابن اسحاق دجّال ہے ۔

(جامع صہ ۱۹۸)

امام ابو حنیفہ سے کسی نے پوچھا کہ جابر الجعفی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ۔ فرمایا ھو کذاب وہ بہت بڑا جھوٹا ہے ۔

(جامع صہ ۱۹۵)

الاعمش حدیث کا امام تھا ۔ علی بن خشرم المروزی (وفات ۲۵۷ھ) فضل بن موسیٰ السینانی المروزی سے روایت کرتا ہے کہ ایک مرتبہ الاعمش بیمار پڑ گئے ، تو فضل بن موسیٰ ، اور امام ابو حنیفہ اس کی عیادت کو گئے ۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا ۔ اگر میرا آنا آپ کو ناگوار نہ گذرتا ، تو میں ہر روز آتا ۔ اعمش نے جھٹ کہا ۔ مجھے تو تیرا اپنے گھر میں بھی رہنا گوارا نہیں ۔

(جامع صہ ۱۹۹)

الاعمش کے متعلق امام ابو حنیفہ کی رائے یہ تھی ۔ کہ نہ وہ روزے رکھتا ہے اور نہ جنابت کے بعد غسل کیا کرتا ہے ۔ یعنی ایک فاسق اور نجس سا آدمی ہے ۔

(جامع صہ ۱۹۹)

سعید بن المسیب المدنی (وفات ۱۰۵ھ) اور حسن بصری ، عکرمہ ، (وفات ۱۰۵ھ) کو جھوٹا کہا کرتے تھے ۔ اور یہ ان کو کذاب سمجھتا تھا ۔

(جامع ص ۱۹۷ - ۱۹۸)

قتادہ (وفات ۱۱۸ھ) یحییٰ بن ابی کثیر (وفات ۱۲۹ھ) کو جھوٹا سمجھتا تھا اور یہ اُسے۔ (جامع صہ ۱۹۹)

اصمعی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلیمان التیمی (وفات ۱۴۳ھ) کے ہاں ابن عروبہ کا ذکر چل پڑا تو اصمعی نے کہا کہ ابن ابی عروبہ اور اس کا اُستاد قتادہ دونوں جھوٹے ہیں۔ (جامع صہ ۲۰۰)

یحییٰ بن معین پہلا محدّث ہے، جس نے راویوں کے حالات قلمبند کیے تھے۔ آپ امام شافعیؒ کے متعلق فرماتے ہیں هو لیس بثقۃ آپ کی روایات قابل اعتماد نہیں ہیں۔

(کتاب فی الضعفا۔ حافظ ازدی محمد بن الحسین الموصلی

(و جامع صہ ۲۰۱)

حضرت امام مالکؒ پر ابن ابی ذئب۔ ابراہیم بن سعد۔ اور ابراہیم بن ابی یحییٰ نے سخت نکتہ چینی کی ہے۔ السّاجی۔ کتاب العلل میں لکھتا ہے کہ عبدالعزیز بن سلمہ۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم۔ ابن اسحاق۔ ابن ابی یحییٰ اور ابن ابی الزناد۔ امام مالک کی حدیث کو اِس لیے قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے کہ آپ نے ثور بن زید اور سعد بن ابراہیم، جیسے جھوٹے راویوں سے بھی احادیث روایت کی ہیں۔

(جامع صہ ۲۰۱)

امام ابوحنیفہ کے اُستاد حمّاد بن سلیمان سے کسی نے پوچھا کہ حجاز کے محدّثین عطا، طاؤس اور مجاہد کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ تو کہا:

وصبیانکم اعلم منہم — تمہارے نادان بچے بھی اُن سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔

(جامع صہ ۱۹۶)

امام شعبی کوفی کے ہاں امام ابراہیم نخعی کوفی (وفات ۹۵ھ) کا ذکر آیا تو کہنے لگا۔ یہ یک چشم رات کے وقت ہر مسئلہ مجھ سے پوچھ جاتا ہے اور دن کے وقت لوگوں پہ اپنی علمیت کا رعب گستا رہتا ہے نخعی کو یہ بات پہنچی تو اس نے کہا هو کذاب وہ مہا جھوٹا ہے۔

(جامع صہ ۱۹۶)

جابر بن یزید کا قول ہے۔ کہ میرے پاس ستر ہزار احادیث النبی ہیں جن کا راوی صرف ابوجعفر ہے۔

(فتح الملہم شرح صحیح مسلم طبع مجتبائی صہ ۱۳۵)

اندازہ لگائیے کہ وضع احادیث کی وبا کس قدر عالمگیر تھی۔

ابوجعفر الہاشمی المدنی کی رائے یہ تھی کہ عمرو بن عبید جھوٹا ہے

(فتح الملہم صہ ۱۳۷)

عبیداللہ بن معاذ عنبری کہتے ہیں۔ کہ میں نے شعبہ (وفات ۱۶۰ھ) کو لکھا کہ واسط کے قاضی ابی شیبہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب میں لکھا:

لا تکتب عنہ شیئا و مزق کتابی۔ — اس کی کوئی حدیث مت لکھو اور میرا یہ خط ضائع کردو

(فتح الملہم صہ ۱۳۵)

عفّان کہتے ہیں۔ کہ میں نے صالح المری کے سامنے حماد بن سلمہ بصری (وفات ۱۶۷ھ) کی بیان کردہ احادیث پیش کیں، تو اُس نے کہا، وہ جھوٹا ہے۔

(فتح الملہم صہ ۱۳۸)

یزید بن ہارون بیان کرتا ہے، کہ زیاد بن میمون نے ایک ہی حدیث مجھے تین مختلف موقعوں پر سنائی۔ اور ہر مرتبہ نئے راوی جڑ دیتے چنانچہ مَیں نے قسم کھالی کہ آئندہ اس کی کوئی حدیث بیان نہیں کروں گا۔

(فتح الملہم صہ ۱۳۹)

علی بن مسہر کوفی کہتا ہے۔ کہ مَیں نے اور حمزۃ الزیات نے ابان بن ابی عیاش سے تقریباً ایک ہزار احادیث سنی تھیں۔ حمزہ بیان کرتا ہے کہ ایک رات خواب میں حضور علیہ السلام کے دیدار نصیب ہوئے۔ میں نے وہ تمام احادیث آنحضرت کو سنائیں۔ حضوؐر نے صرف پانچ یا چھ احادیث کو صحیح قرار دیا اور باقی کے متعلق فرمایا۔ کہ میں انھیں نہیں پہچانتا۔

(فتح الملہم صہ ۱۴۰)

ابو اسحٰق الفزاری فرماتے ہیں کہ صرف مشہور اور معتبر راویوں کی احادیث بیان کرو لیکن اگر اسماعیل بن عیاش مشہور راویوں سے بھی کوئی حدیث روایت کرے تو مت مانو۔

لیکن یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اسماعیل ثقہ (قابلِ اعتماد) ہے۔

(فتح الملہم صہ ۱۴۰)

محمد عبدالرحمٰن کے متعلق امام مالک کی یہ رائے ہے کہ وہ ثقہ نہیں۔

لیکن ابو زرعہ اسے ثقہ سمجھتے ہیں۔ یہی حال مندرجہ ذیل راویوں کا ہے:

راوی کا نام	غیر ثقہ کہنے والے	ثقہ سمجھنے والے
شعبہ مدنی	امام مالک	احمد بن حنبل یحییٰ بن معین۔ ابن عدی
فرقد	ایوب۔ ابن حبان	یحییٰ بن معین
ابو الحویرث	امام مالک	ابن حبان
شرجیل بن سعید	ابن عدی۔ محمد سعد۔	سفیان بن عیینہ۔ ابن حبان یحییٰ بن معین

(فتح الملہم صـ ۱۴۱ - ۱۴۲)

کہاں تک گنوں، سینکڑوں ایسے راوی ہیں جنھیں ایک جماعت سچا سمجھتی ہے اور دوسری جھوٹا۔ شعبہ المدنی کو دیکھیے کہ امام مالک جیسا عظیم الشان مجتہد اُسے جھوٹا سمجھتا ہے۔ اور امام احمد بن حنبل جیسا امام الدہر اسے سچا قرار دیتا ہے۔ کس کی سُنیں، اور کس کی نہ سُنیں۔ ائمۂ حدیث اور صحابۂ کرام کے فتوے ایک دوسرے کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں۔ تو جو احادیث ان صحابہ، ان ائمۂ حدیث اور ان دلچسپ راویوں سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں۔ اُن پہ کوئی کہاں تک اعتماد کرے۔

پانچواں باب

حدیث پر ایک مکالمہ

ہمارے علماء کا خیال یہ ہے کہ حدیث وحی خفی ہے۔ چند روز ہوئے اسی عقیدہ کے ایک مولانا میرے ہاں تشریف لائے۔ اور اس موضوع پہ مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

مولانا۔ قرآن شریف میں مذکور ہے۔ کہ وحی تین طرح سے آتی ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا ......

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان سے گفتگو کرنا چاہتا ہے تو تین طریقے استعمال کرتا ہے۔ یا تو اپنا پیغام بغیر کسی وساطت کے اُس کے دِل پہ نازل کر دیتا ہے، یا پردے کے پیچھے سے گفتگو کرتا ہے۔ اور یا اپنے قاصد یعنی جبریل علیہ السلام کو پیغام دے کر بھیجتا ہے۔ یہ تیسری قسم وحی متلو، یا وحی جلی ہے اور باقی دو قسمیں وحی خفی ہیں۔ جن کا دوسرا نام حدیث ہے۔

برقؔ۔ وحی کے اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

م ۔ پیغامِ خدا ۔

ب ۔ بہت اچھا ۔ جب قرآن بھی پیغامِ خدا ہے اور حدیث بھی ۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ رسولِ اکرم صلعم اور آپ کے صحابہ نے قرآن کو لکھنے اور محفوظ رکھنے کے لیے تمام تر انسانی وسائل اختیار کیے ۔ لیکن حدیث کو نہ صرف نظر انداز کر دیا ۔ بلکہ حضورؐ نے احادیث لکھنے سے منع فرما دیا اور صدیقؓ و فاروقؓ نے احادیث کو مٹانے اور جلانے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی ۔ حدیث اللہ کا پیغام ہو اور صحابہ اُسے جلاتے پھریں ۔ یعنی چہ ؟

م ۔ فلاں عالم ۔ فلاں مجتہد ، اور فلاں امام نے حدیث کو وحیِ خفی کہا ہے ۔ آپ کون ہیں ، انکار کرنے والے ۔

ب ۔ مجھے سچائی سے معاندت نہیں ۔ بات کو واضح کیجیے ۔ اور میں ابھی آپ کا ہم خیال بن جاتا ہوں ۔ اگر حدیث وحی تھی تو اسے قرآن کے متن میں کیوں شامل نہ کیا گیا ۔ وہ بھی اللہ کا پیغام ، یہ بھی اللہ کا پیغام ۔ پھر فرق کیا تھا ؟

م ۔ قرآن کے مضامین اور الفاظ ہر دو الہامی تھے ۔ اور احادیث کے صرف معانی بذریعہ وحی نازل ہوئے تھے اور الفاظ رسول اللہ صلعم کے اپنے تھے ۔

ب ۔ اللہ نے یہ دو قسم کے پیغامات کا سلسلہ کیوں شروع کیا تھا ۔ کیا اللہ کے خزانے میں الفاظ کی کمی ہو گئی تھی ۔ یا کوئی خاص مصلحت اس

دور نگی کی متقاضی تھی ۔ اللہ تعالےٰ جب مضامین اتارنے کی تکلیف گوارا کر رہا تھا تو الفاظ بھی ساتھ ہی بھیج دیتا ۔ مزید بر آں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب قرآن و حدیث ہر دو وحی تھے ، تو ایک کی حفاظت کیوں کی گئی اور دوسرے کو مٹانے کے وسائل کیوں اختیار کیے گئے ۔ کیا حدیث کوئی گھٹیا قسم کی وحی تھی ۔ اگر الفاظ ساتھ نہیں تھے تو نہ سہی ۔ پیغام تو اللہ ہی کا تھا ۔ پھر رسول اللہ صلعم کے اپنے الفاظ کیا کم تھے ۔ یہ آپ ہی کا قول تو ہے ۔ انا افصح العرب والعجم (میں عرب و عجم کا فصیح ترین انسان ہوں) پیغام اللہ کا ، کلام افصح العرب والعجم کا اور پھر صحابۂ کرامؓ اس کی حفاظت نہ کریں ۔ آخر بات کیا تھی ؟

م ۔ کیا آپ نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔ کہ رسول جو کچھ منہ سے ادا فرماتے ہیں وہ وحی ہے ۔ اس آیت کی موجودگی میں آپ حدیث کے وحی ہونے سے کیسے انکار کر سکتے ہیں ؟

ب ۔ آپ نے اپنے "مقدمے" کو اور زیادہ خراب کر لیا ہے ۔ پہلے آپ فرما رہے تھے کہ حدیث کے الفاظ الہامی ہیں ۔ اور الفاظ رسول اللہ صلعم کے ۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ اُن کا نطق ، یعنی الفاظ بھی الہامی تھے ۔ مطالب بھی خدائی ، اور الفاظ بھی خدائی ۔ پھر یہ احادیث قرآن سے جدا کیوں کر دی گئیں ؟

س۔ تو پھر آپ قرآن کی اُس وحی والی آیت کا کیا ترجمہ کریں گے؟
ج۔ اُس آیت کا مطلب صاف ہے کہ اللہ تعالےٰ جب کسی پیغمبر کو دنیا میں بھیجتا ہے، تو اُس کی طرف پیغامات بھیجنے کے لیے تین طریقے اختیار فرماتا ہے۔ کبھی پردے کے پیچھے سے بولتا ہے۔ کبھی قاصد بھیجتا ہے اور کبھی رسول پر ایک خاص کیفیت طاری کر کے پیغام اُس کے دماغ پہ نازل کر دیتا ہے۔ ہر الہامی کتاب کے نزول کے وقت یہ تینوں طریقے استعمال کیے گئے اور احادیث میں وحی قرآنی کے ان تینوں مدارج کا ذکر موجود ہے۔ معراج کی رات اللہ نے رسول سے گفتگو کی۔ بارہا جبریل انسانی شکل میں آئے۔ کچھ کہا۔ کچھ پوچھا، اور چلتے بنے۔ یہ بھی مذکور ہے۔ کہ بیٹھے بیٹھے رسول اللہ صلعم پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی جسم اتنا وزنی ہو جاتا تھا کہ آپ کی ناقہ بوجھ کو سہار نہ سکتی تھی اور بیٹھ جاتی تھی۔ آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ نتھنوں سے خراٹوں کی آوازیں نکلنے لگتی تھیں۔ اور یہ وہ وقت ہوتا تھا، جب آپ پر بلا واسطہ وحی آتی تھی۔

بہرحال، وحی کسی طریقے سے آئے، وہ وحی ہے۔ واجب التعمیل اور واجب الحفاظت۔ قرآن کے متعلق اللہ کا یہ ارشاد موجود ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ
یہ ذکر اور یہ ہدایت ہم نے نازل کی

لَہٗ لَحَافِظُوْنَ ۔ اور ہم اس کی حفاظت کریں گے

قرآن کی ایسی حفاظت ہوئی کہ تمام عالم نے ہماری کتاب کی صحت پر شہادت دی۔ لیکن حدیث بانو بہی بھلی، اس کا تو وہ ستیاناس ہوا، کہ اس سے زیادہ محرّف اور مسخ شدہ لٹریچر دنیا کے صفحے پہ موجود نہیں۔ مولانا! خدارا کچھ سوچیے یہ مطالب خدائی ہوں، الفاظ بھی بقول آپ کے الہامی ہوں اور پھر اللہ اپنے وعدے کے مطابق نہ اس کی حفاظت کرے، نہ ہمیں اس پر ایمان لانے کا حکم دے، نہ اپنے رسول کو اس کی کتابت کا حکم دے، نہ صحابہ کو اس کی تباہی سے روکے۔ آخر بات کیا تھی؟

م۔ آپ ہی کچھ بتا دیں۔ میرے تو حواس تک آپ کی زبان درازی نے اُڑا دیے ہیں۔

ب۔ بات صاف ہے۔ اللہ نے رسول کریم کو جو کتاب بذریعۂ وحی عطا کی تھی، اس کا نام قرآن ہے، نہ کہ صحیح بخاری ملاحظہ ہوں یہ آیات۔

اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ ہم نے جو کتاب بذریعۂ وحی تمھیں عطا کی ہے اس کا نام قرآن ہے۔ (سورۂ یوسف)

"وحی" کے لفظ میں وحی کے تینوں مفہوم آ جاتے ہیں۔ اللہ نے سارے قرآن میں کہیں نہیں کہا۔ نہ صراحۃً، نہ اشارۃً، نہ کنایۃً،

کہ وحی بواسطہ جبریل سے ہم قرآن اُتار رہے ہیں۔ اور وحی کے باقی طریقے حدیث نازل کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ کیا سارے قرآن میں حدیث کا ضمناً بھی کہیں ذکر ہے؟ اگر نہیں ہے تو آپ اسے ہمارے ایمان کا جزو کیسے بنا رہے ہیں۔ اگر حدیث پہ ایمان لانا ایسا ہی ضروری تھا، تو جس خدا نے لاکھوں انبیاء، سینکڑوں صحائف اور کروڑوں ملائکہ پہ ایمان لانے کا بیسیوں مرتبہ حکم دیا تھا، کیا وہ حدیث پہ ایمان لانے کا حکم نہیں دے سکتا تھا۔ اگر اللہ نے اس چیز کو قابلِ ایمان نہیں سمجھا، تو آپ کون ہیں ہمیں حدیثوں پہ ایمان لانے کا حکم دینے والے؟

م۔ اور آپ کے پاس وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ..... کا کیا جواب ہے؟

ب۔ آیت کا مفہوم نہایت صاف ہے کہ قرآن رسول کی خواہشات کا آئینہ دار نہیں۔ بلکہ وہ اللہ کا پیغام ہے۔ مطلب یہ کہ قرآن رسول کی تصنیف نہیں، کہ جو جی میں آیا، اُس کے مطابق آیات تیار کر لیں (وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ) بلکہ وہ ہمارا پیغام ہے جو ہماری مشیت کی ترجمانی کر رہا ہے (اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى) اس آیت میں هُوَ کا مرجع ہے قرآن، جو وہاں محذوف ہے۔ آپ کہیں گے محذوف کے لیے کوئی قرینہ چاہیئے۔ بھائی صاحب! سینکڑوں آیات اس حذف کے لیے بطور قرینہ موجود ہیں۔ مثلاً۔

وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْآنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ ۔ — نہیں ڈرانے کے لیے مجھ پر قرآن نازل کیا گیا ہے ۔

اور آپ کہتے ہیں کہ حدیث بھی ساتھ اتری ہے ۔ ایک اور آیت دیکھیے ،

اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا — ہم نے قرآن نازل کیا ، جو عربی زبان میں ہے ۔

ان کے علاوہ درجنوں اور آیات اسی مضمون پر موجود ہیں ، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے رسول کو صرف قرآن دیا ، جو ہدایت ہے نور ہے ، روشنی ہے ، فرقان ہے ، رحمت ہے ، کامل ہے ، احسن ہے اتم ہے اور اس طرح محفوظ ہے کہ

لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ ؕ — اس میں باطل کسی راستے داخل ہو ہی نہیں سکتا ۔

اور دوسری طرف حدیث کا باطل نے وہ بلتنر بگاڑا ہے کہ لاکھوں آفتاب و ماہتاب لے کر بھی ڈھونڈو ، تو حقیقت کا سراغ نہ مل سکے الّا ماشاء اللہ ۔

م ۔ لیکن حدیث کی حجیت پر ایک اور آیت موجود ہے ۔

ب ۔ فرمائیے !

م ۔ اطیعوا اللہ والرّسول (اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت کرو) اللہ نے قرآن دیا ہے ۔ اور رسول نے حدیث ۔ اس لیے دونوں پر

ایمان لانا فرض ہے۔

ب۔ آپ نے پوری آیت نہیں پڑھی واولی الامر منکم چھوڑ گئے ہیں۔ ساری آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہوا "اللہ، رسول، اور حاکم وقت (جو تم میں سے ہو) کو مانو"۔ اگر رسولؐ کی اطاعت کا یہی مطلب ہے۔ کہ آپ کے تمام اقوال پر ایمان لاؤ، تو پھر حاکم وقت کے اقوال پر بھی ایمان لانا پڑے گا۔ کیونکہ اللہ نے اس کی اطاعت کا بھی ویسے ہی حکم دیا ہے۔ کئی بادشاہ مصنف بھی تھے۔ مثلاً بابر نے "تزک بابری" لکھی، جہانگیر نے "تزک جہانگیری"، اور اورنگ زیب کی بھی ایک آدھ کتاب موجود ہے۔ یہ اپنے زمانے میں "اولی الامر" تھے۔ تو کیا ہم تزک بابری و جہانگیری پر بھی ایمان لاتے پھریں؟

م۔ تو کیا اقوال رسولؐ قابل ایمان نہیں؟

ب۔ کیوں نہیں! بشرطیکہ کہیں سے کوئی قول رسولؐ مل جائے۔ رونا تو اسی بات کا ہے کہ اقوالِ رسولؐ کا دستیاب ہونا بیحد دشوار ہے۔ اگر اقوالِ رسولؐ مل جاتے، تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا۔ اور قرآن پہ ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرۂ ایمان میں شامل ہو جاتے۔

م۔ آپ "اطیعو الرسول" کا مفہوم کیا سمجھتے ہیں؟

ب۔ ہر حکومت کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ ہر دفتر، ہر افسر اور ہر ملازم کے لیے پہلے چند قوانین بناتی ہے اور پھر حکم دیتی ہے۔ کہ ان

ہدایت و قوانین کی پابندی کرو۔ اور جو افسران قوانین کے نفاذ کے
لیے تم پر مقرر کیا گیا ہے۔ اس کی اطاعت کرو۔ یہی حال ہمارا
اور اللہ کا ہے۔ اللہ نے ہمیں قوانین کی ایک کتاب یعنی قرآن
دے کر اپنے رسول کو ہمارا امیر اور اولی الامر تباد یا۔ تاکہ وہ ان
قوانین کو نافذ کر سکے۔ اور ہمیں حکم دے دیا کہ رسول کی اطاعت
کرو۔ رسول خدا جب تک بقید حیات رہے، صرف انہی قوانین
کی تعمیل کراتے تھے۔ جن کی تفصیل قرآن میں دی ہوئی تھی۔ اور آج
بھی ہم پر رسول خدا کی اطاعت قرآنی احکام کی حد تک فرض ہے۔
م۔ آپ کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اگر رسول قرآنی احکام کے علاوہ
کسی اور بات کا حکم دیں، تو آپ اس کی تعمیل نہیں کریں گے۔
ب۔ یہ آپ نے فرض ہی کیوں کر لیا۔ کہ رسول صلعم قرآن کے علاوہ کسی
اور چیز کا حکم دینے کی بھی جرأت کر سکتے تھے۔ انھیں بار بار کہا
جا رہا تھا۔

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ اے رسول! تم وہ احکام امت تک
پہنچاؤ جو ہم تمھیں دے رہے ہیں۔

کیا رسول اکرم صلعم اس صریح حکم سے سرتابی کی جرأت کر سکتے تھے؟
لفظ رسول کے معنی ہی قاصد۔ ایلچی اور چٹھی رساں ہیں۔ تو ایک
قاصد خود کیسے آقا بن سکتا ہے؟
آپ ایک چھوٹا سا نکتہ پیش نظر رکھیں۔ کہ رسول اکرم صلعم کی دو

حیثیتیں تھیں۔ وہ پیمبر بھی تھے، اور بشر بھی۔ بحیثیت پیمبر ہم اُن کی اطاعت پہ مامور ہیں۔ اور بحیثیت بشر، اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ کہ ہم چاہیں تو کھانے، پینے، چلنے، بولنے، لیٹنے اور سونے میں حضورؐ کی روش اختیار کریں، یا حدودِ شریعت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی پسند، اپنے مذاق، اپنے ملک و ماحول، اور اپنے رجحان سے کام لیں۔ تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں۔ کہ بعض اوقات صحابہ نے آپ کی بشری ہدایات یا مشوروں پہ عمل نہیں کیا تھا۔ مثلاً جب آپ کے غلام زید نے اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہی، تو آپ نے فرمایا کہ امسک علیک زوجک (طلاق مت دو) لیکن زید نے یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ اسی طرح جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضرت عمرؓ کا اصرار تھا کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔ لیکن حضورؐ نہ مانے، اور وحی نے حضرت عمرؓ کی تائید کر دی۔ حضورؐ نے گیارہ نکاح کیے تھے۔ لیکن ہمیں اس کی اجازت نہیں۔ حضورؐ نے ایک اندھے سے بے التفاتی فرمائی تھی۔ جس پہ سورۂ عبس نازل ہوئی۔ اور ملک العرش نے اپنے محبوب کو ایک ہلکی سی ڈانٹ پلا دی۔

اسی طرح کے چند اور واقعات بھی موجود ہیں۔ جہاں صحابہ نے حضورؐ کے بشری رجحانات کی تقلید سے آزاد ہو کر اپنی راہ خود نکالی تھی۔ اور یہی اسلام کا سب سے بڑا وصف ہے کہ قرآن کے گنے ہوئے چند

سادہ سے ابدی احکام کے سوا ہم کسی اور ہنگامی حکم یا ذفتی ہدایت کے لیے مامور نہیں۔

م ۔ وہ جو ائمہ حدیث نے لکھا ہے کہ احادیث میں روایت بالمعنی ہے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ب ۔ روایت بالمعنی کی تشریح کیجیے!

م ۔ بالکل سادہ سا لفظ ہے۔ کہ احادیث میں رسول صلعم کے الفاظ منقول نہیں، بلکہ صرف مطالب منقول ہیں۔

ب ۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ مضمون حضور صلعم کا ہوتا ہے اور الفاظ راوی کے لیے

م ۔ جی ہاں!

ب ۔ تو پھر آپ ہر حدیث میں یہ کیوں کہا کرتے ہیں۔ قال رسول اللہ ۔۔۔ اگر ہر حدیث راوی کا قول ہے، تو پھر وہ قول رسول نہیں ہو سکتی، یہ تو ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں، ایک ہی قول راوی کا بھی ہو اور حضورؐ کا بھی۔

مزید براں اگر روایت بالمعنی تسلیم کی جائے، تو اس صورت میں حدیث

ٖلہ بہت خوب پہلے تو رسولؐ اللہ سے روایت بالمعنیٰ کرتے ہیں۔ پھر راوی رسولؐ سے روایت بالمعنی کی تکرار کرتا ہے۔ اگر اسی طرح ہر راوی "بالمعنی" کے مصرع کا تکرار کرتا رہے تو آخری راوی تک پہنچ کر غریب "معنی" کا کچومر نہ نکل جائے گا؟ (ناظر ثانی)

کبھی وحی خفی نہیں بن سکتی۔ اس لیے کہ تمام احادیث راویوں کے اقوال ہیں۔ اور وحی حضورؐ پہ آیا کرتی تھی، نہ کہ راویوں پر۔ ایک عام انسان کا قول وحی نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اگر آپ وحی خفی کا مفہوم اور واضح کر دیں، تو شاید ہم کسی مفید نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں۔ اس لیے کہ یہ وحی بلا الفاظ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ وحی کے معنی ہیں پیغام۔ اگر اللہ کوئی پیغام بھیجے، اور الفاظ ساتھ نہ ہوں، تو وہ سمجھ میں کیسے آئے گا؟

د۔ آپ وحی خفی کا مطلب "سوجھنا" سمجھ لیں۔ کہ حضورؐ کو جب کوئی بات سوجھ جاتی تھی، تو وہ اسے اپنے الفاظ میں ادا کر دیتے تھے۔ سوجھنے ہمیشہ خیالات ہی ہیں، نہ کہ الفاظ۔ اور یہی وحی خفی ہے۔

ب۔ سوجھنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ ایک فلسفی کسی نئی اُلجھن کو پہروں، ہفتوں، بلکہ مہینوں سوچتا ہے اور کسی نہ کسی دن اُسے حل سوجھ ہی جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حل اُس فلسفی کے دماغ میں اللہ نے ڈالا تھا۔ لیکن اُسے وحی یا الہام نہیں کہتے، بلکہ القا کہتے ہیں۔ علمائے مغرب بے شمار مسائل سے دوچار ہوئے۔ سوچتے رہے حل سوجھتے رہے۔ اور آج وہ ساری کائنات کو مسخر کرنے کی فکر میں ہیں۔ کیا آپ ان لوگوں کی رفتارِ فکر کو بھی وحی کہیں گے؟ جس طرح ہم زید و بکر سوچتے ہیں، اور انھیں نئے نئے نتائج سوجھ جاتے ہیں۔ اسی طرح حضورؐ بھی سوچا کرتے تھے۔ یہ آپ نے

کیسے فرض کر لیا، کہ اُس معلّم کائنات میں فکر تھی ہی نہیں۔ اگر تھی تو اسے قطعاً استعمال نہیں فرماتے تھے۔ اور ہر معاملے میں وحی کے منتظر رہتے تھے۔ کیا لوگوں کو استعمال فکر و عقل کی دعوت دینے والا نبیؐ ..... لقوم یتفکرون۔ یتدبرون یعقلون۔ (یہ قرآن ان لوگوں کے لیے ہے جو سوچتے ہیں۔ اور عقل کو استعمال کرتے ہیں) خود نہیں سوچا کرتا تھا۔ اور اسے اپنے آپ پر اس قدر بے اعتمادی تھی کہ جب تک جبریل کوئی مشورہ نہ دیتا، یا اللہ تعالےٰ رہنمائی نہ کرتا، تو وہ دین و دنیا کے کسی معاملے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہ وحی خفی کا شوشہ تعظیم رسول کے لیے نہیں۔ بلکہ تنقیص رسول کے لیے چھوڑا گیا ہے۔

ہمارے بعض علماء تو عشقِ حدیث میں یہاں تک لکھ چکے ہیں۔ کہ اللہ کے کلام کو نہ صرف احادیث کا محتاج ٹھہراتے ہیں، بلکہ یہ کہتے ہوئے بھی سُنے جاتے ہیں، کہ اگر اللہ کا کوئی قول رسول کے قول سے متصادم ہو جائے تو قولِ خدا کو منسوخ سمجھو۔ یعنی اللہ کے جاری کردہ احکام کو اللہ کی مرضی کے بغیر ایک حدیث بھی منسوخ کر سکتی ہے۔ احادیث کی سینہ زوری، اور قرآن کی بیچارگی کا تماشہ دیکھیے۔

ھ۔ لاحول ولا قوۃ اِلّا باللہ۔ یہ صریح بہتان ہے۔ کوئی عالم اس طرح کی

جسارت نہیں کرسکتا۔

ب۔ ثبوت حاضر ہے۔

(۱) عن اوزاعی عن مکحول قال القرآن احوج الی السنۃ من السنۃ الی الکتاب

اوزاعی مکحول کے اس قول کے راوی ہیں کہ حدیث قرآن کی اتنی محتاج نہیں جتنا قرآن حدیث کا محتاج ہے۔

(جامع بیان العلم ص۲۲۴)

(۲) امام شافعی کا قول ہے۔

القرآن لا ینسخہ الا القرآن

کہ قرآن کو قرآن ہی منسوخ کرسکتا ہے۔

لیکن ابو الفرج نے حضرت امام مالک کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے (اور یہ نسبت صریحاً غلط معلوم ہوتی ہے)

ان السنۃ تنسخ القرآن

کہ حدیث قرآن کو منسوخ کرسکتی ہے۔

عام دستور تو یہی ہے۔ کہ یا تو ایک افسر اپنے کسی پچھلے حکم کو خود منسوخ کیا کرتا ہے۔ اور یا اس سے کوئی بڑا افسر۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ ڈپٹی کمشنر کے جاری کردہ حکم کو کوئی نائب تحصیلدار منسوخ کرتا پھرے۔ لیکن ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ ارض وسما کے خالق اور ان کروڑوں دنیا کے مہیب فرمانروا کا حکم، اس کا ایک قاصد منسوخ کرسکتا ہے۔ اور وہ خاموش، دیکھتا رہتا ہے۔

ھ۔ آپ نے حدیث کس سے پڑھی تھی؟

ب۔ اپنے آپ سے!
م۔ کیا مطلب؟ کیا آپ کا کوئی شیخ الحدیث نہیں؟
ب۔ جی نہیں!
م۔ اگر آپ نے حدیث پڑھی نہیں۔ آپ کو احادیث کی اقسام معلوم نہیں، ائمۂ حدیث کی خبر نہیں۔ اسناد و رجال سے آگہی نہیں۔ تو پھر آپ جاہل مطلق ٹھہرے۔ آپ سے گفتگو ہی فضول ہے۔ لا لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ لاحول ولا ....
(اور مولانا داغ مفارقت دے گئے)

چھٹا باب

تحریفِ احادیث کے اسباب

تحریف احادیث کے کئی اسباب تھے !

اوّل۔ حضور صلعم نے احادیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا۔ اور جو چیز لکھی نہ جائے اُسے تحریف سے بچانا ناممکن ہو جاتا ہے سیدھی سادی بات میں ڈرامائی رنگ بھرنا، اور ایک معمولی سے واقعے کو "سنسنی خیز" بنانا اگر انسانی فطرت نہیں، تو یقین کیجیے کہ اس سے کمتر بھی نہیں۔ اپنے آپ کو دیکھیے، کتنی ایسی باتیں ہیں جنھیں آپ ہُو بہُو نقل کر دیتے ہوں۔ نہ ان میں رنگ بھرتے ہوں، اور نہ مبالغہ کرتے ہوں گزشتہ ۴۷ برس میں مجھے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا۔ جو رنگ آمیزی، مبالغہ اور دیگر سخن گسترانہ عیوب سے پاک ہو۔ میں خود ان عیوب سے مبرا نہیں اور آج کہ میری عمر ۴۷ برس سے کچھ اوپر ہو چکی ہے۔ علم کے کئی منازل طے کر چکا ہوں۔ متانت حقیقت اور واقعیت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں۔ پھر بھی داستان سرائی۔ مبالغہ اور رنگ آمیزی سے پوری طرح نہیں بچ سکا۔ ہم ہر روز اخبارات میں ایک ہی واقعہ کی

مختلف تعبیریں دیکھتے ہیں۔ چند روز[1] کا ذکر ہے کہ پاکستان کے وزیرِ اعظم لاہور تشریف لائے۔ یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک جلسہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر میاں عبدالباری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جب میاں صاحب تقریر کے لیے اُٹھے، تو مجمع سے آوازیں بلند ہوئیں۔ "ہم خائنوں کے سردار کی تقریر نہیں سننا چاہتے۔ بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ، چنانچہ وہ بیٹھ گئے"۔ "نوائے وقت" اور اس کے ہمنواؤں نے لکھا کہ شور مچانے والوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن "زمیندار" اور چند دیگر اخبارات کا بیان ہے کہ یہ جلسہ میں شریک ہونے والے دو لاکھ انسانوں کی متفقہ آواز تھی۔ واقعہ دو دِن کا ہے۔ دو لاکھ انسانوں نے اسے دیکھا تمام اخبارات کے نمائندے بھی وہاں موجود تھے۔ اور پھر اصل حقیقت نہیں کھلتی۔ اسی طرح آج سے کچھ دو روز[2] پہلے والا کیمپ میں مہاجرین کشمیر کے دو گروہ، باہم اُلجھ پڑے۔ اور فوج کو مجبوراً گولی چلانا پڑی۔ آناً فاناً یہ خبر سارے علاقے میں پھیل گئی۔ مَیں بھی اس واقعہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ بازار میں سات آدمیوں کے مرنے اور ڈیڑھ سو کے زخمی ہونے کی داستان چکر لگا رہی تھی ذرا آگے مقتولین کی تعداد دو سو، اور آگے چار سو تھی۔ لیکن جب اُن سرکاری حکام سے حقیقت پوچھی، جو موقعہ پر موجود تھے تو معلوم ہوا کہ مقتولین کی تعداد کل چار ہے اور زخمیوں کی صرف بارہ۔

---

[1] ۲۲۔ اگست ۱۹۴۹ء۔ [2] ۲۶۔ اگست ۱۹۴۹ء

احادیث کی تحریف میں انسان کے اِس فطری خاصّہ کا کافی دخل ہے۔ حضور علیہ السلام سے ایک بات نکلی۔ ہزاروں نے سُنی۔ رفتہ رفتہ اس میں ردّ و بدل ہونے لگا۔ زمانہ گذرتا گیا اور بات بگڑتی گئی۔ ہزاروں سے نکل کر لاکھوں، اور لاکھوں سے کروڑوں زبانوں تک پہنچی۔ جہاں کوئی حصّہ بھول گیا، پاس سے بڑھا لیا۔ اصلی قول محفوظ نہیں تھا کہ مقابلہ کر کے تصحیح کر لیتے۔ راویوں میں اچھے بھی تھے اور بُرے بھی۔ موخرالذکر نے احادیث کو اپنی اغراض کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا، اور بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔

حضورؐ کا زمانہ تھا۔ خود سرورِ کائناتؐ بقیدِ حیات تھے کہ حضرت زبیرؓ سے اُن کے بیٹے عبداللہؓ نے پوچھا کہ آپ روایتِ حدیث سے کیوں اجتناب کیا کرتے ہیں؟ فرمایا۔ اللہ کی قسم! احادیث میں اختلاف ہو گیا ہے میں نے حضورؐ کی زبانِ مبارک سے یہ حدیث ان الفاظ میں سنی تھی:

من کذب علی فلیتبوا مقعدہ من النار۔ جو شخص کوئی غلط قول میری طرف منسوب کرے گا وہ جہنم میں جائے گا۔

لیکن لوگوں نے اس میں "متعمدًا" کا لفظ (من کذب علیّ متعمدًا) بڑھا لیا ہے۔

اِسی طرح جب حضرت عبداللہؓ بن عمرو کے سامنے حضرت ابوہریرہؓ کی کُتّے والی حدیث بیان کی گئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مویشیوں کی رکھوالی اور کھیتی کی حفاظت کے لیے کُتّا پالنا جائز ہے۔ تو ابن عمروؓ نے فرمایا۔

کیوں نہ ہو۔ ابو ہریرہؓ کھیتوں کا مالک جو ٹھہرا۔ (توجیہہ ص۰۰)

چونکہ حضرت ابو ہریرہ نے اپنے کھیت کے لیے کتا پال رکھا تھا اس لیے بقول ابن عمرؓ آپ نے ایک حدیث تراش کر کتا پالنے کا جواز نکال لیا تھا۔

زمانہ گذرتا گیا۔ اللہ سے ڈرنے، اور ذاتِ رسول سے عشق رکھنے والے لوگ ختم ہوتے گئے۔ اور بعد میں آ گئے ایسے مسلمان جو کعبے گرانے، آلِ رسول کو ذبح کرنے۔ اور حرمِ نبوی کے معصوم بچوں کو گرم ریگستان میں تڑپا تڑپا کر ہلاک کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ کیا ان حضرات کے لیے احادیث میں ردّوبدل کوئی بڑی بات تھی؟ کروڑوں سچی اور جھوٹی زبانوں۔ ان مشوش زمانوں، اور اسلام پر ان حادثوں سے گذری ہوئی احادیث کو صحیح سمجھ کر ان پر مذہب کی تعمیر اُٹھانا صحیح نہیں۔

ایک اعتراض:- ہمارے بعض بزرگ کہتے ہیں کہ احادیث کو چھوڑ دو گے، تو نماز پڑھنے کا طریقہ کہاں سے سیکھو گے۔ اور زکواۃ کی مقدار کہاں سے معیّن کرو گے؟

جواب اِس سوال کے تین جواب ہیں۔ اوّل۔ اگر ہم احادیث کے مطابق نماز پڑھنا شروع کر دیں، تو ہر مسجد کی نماز دوسری سے مختلف ہو جائے گی۔ تفصیل آگے آئے گی۔

دوم۔ رسول کریم صلعم کو لاکھوں مسلمانوں نے نماز پڑھتے دیکھا اور پیر

کردہ دل سنے ۔ اور یہ سلسلہ ہم تک پہنچ گیا ۔ کیا ان ارب، کھرب انسانوں کی شہادت کافی نہیں ؟ کیا دیہاتی مسلمان صحیح بخاری سے نماز کا طریقہ سیکھا کرتے ہیں ؟ جس طریقے سے ہمارے آبا و اجداد نماز ادا کرتے رہے، ہم نے وہ سلسلہ جاری رکھا، اور اب نئی نسل ہماری نقل اتار رہی ہے ۔ یہاں صحیح بخاری کی ضرورت ہی کہاں پیش آتی ہے ۔ کشمیر کی ساری وادی میں غالباً صحیح بخاری کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہوگا ۔ لیکن وہ لوگ پھر بھی نہایت صحت سے نماز پڑھتے ہیں ۔

سوم ۔ قرآن ہر لحاظ سے ایک مکمل کتاب ہے ۔ جس طرح ہم کسی تفسیر، تاریخ یا تصوف کی کتاب کو یہ منصب عطا نہیں کر سکتے ۔ کہ وہ اسلام میں کسی نئے حکم یا اصول کا اضافہ کرے ۔ اسی طرح ہم حدیث کو بھی یہ رتبہ نہیں دے سکتے ۔ انسانی اقوال کی بے اندازہ آمیزش کی وجہ سے اس کی حیثیت انسانی تصنیف کی ہو چکی ہے ۔ جس طرح بعض باقی انسانی تصانیف کو یہ حق حاصل ہے کہ قرآنی احکام و آیات کی شرح بیان کریں ۔ اسی طرح محدثین کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا ۔ اگر ان لوگوں نے صلوٰۃ و زکوٰۃ کی کوئی ایسی تشریح پیش کی ہے، جو قرآن سے متصادم نہیں ہوتی اور تواتر عمل کے بھی خلاف نہیں، تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے ؟ لیکن ہم ان حضرات کو اسلام میں کسی ایسے اضافے کی اجازت نہیں دے سکتے ۔ جو انسانی عقل، فطرت، اور قرآن ہر سہ سے متصادم ہوتا ہو ۔

باقی رہا زکواۃ کا مسئلہ۔ تو اسے خود قرآن نے بھی واضح کر دیا ہے۔ زکواۃ ہے کیا چیز؟ اللہ کے راستے میں مالی قربانی۔ ہمارے فقہا کہتے ہیں کہ ادائے زکواۃ کے لیے ایک وقت (ماہ رجب) اور مقدار (اڑھائی فی صدی وغیرہ) معیّن ہے۔ لیکن اللہ کے ہاں اس کا وقت تو معیّن کوئی نہیں۔ البتہ مقدار کا تعیّن ضرور ہے۔ اللہ نے مسلمان کی تعریف یہ بیان کی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط

اللہ نے مسلمانوں سے دو چیزیں لے لی ہیں، جان اور مال، اور اس کے صلے میں انھیں جنت دیدی ہے۔

یعنی ہماری جان اور مال کا مالک اللہ ہے۔ جس طرح جاں سپاری کا کوئی خاص وقت معیّن نہیں۔ جس وقت جنگ کا بگل بجا مسلمان سر بکف حاضر۔ اسی طرح مال سپاری کا بھی کوئی خاص وقت نہیں۔ جب بھی ملت پہ ابتلا کا وقت آیا، مسلمان نے سب کچھ خدا اور رسول کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ہمارا مُلّا اس طرح کے مالی ایثار کو صدقہ یا انفاق کہتا ہے اور اصطلاحی بحثوں میں اُلجھ پڑتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ زکواۃ کے معنی ہیں "پاکیزگی"۔ چونکہ اللہ کی راہ میں مالی ایثار منفق اور مال ہر دو کو پاکیزہ بنا دیتا ہے۔ اس لیے لازماً ہر قسم کی مالی قربانی زکواۃ سمجھی جائیگی اگر میری بات پہ یقین نہ آئے تو لیجیے اللہ کا فیصلہ۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً

مسلمانوں سے صدقہ لے کر انھیں مطہر

تُطَهِّرُهُمْ بِهَا وَ تُزَكِّيْهِمْ — اور مزکّی (پاک) بناؤ۔
تُزَکّی کا ماخذ زکواۃ ہے۔ تو گویا اللہ کے ہاں ہر قسم کی مالی قربانی زکواۃ شمار ہوتی ہے۔

قضیۂ اشتراکیت و سرمایہ کا خدائی حل

ہم عرض کر رہے تھے کہ زکواۃ کا کوئی خاص وقت معیّن نہیں۔ لیکن اللہ نے اس کی مقدار یوں معیّن کر دی ہے کہ اشتراکیت و سرمایہ کے تمام جھگڑے مٹا دیئے ہیں۔ اس وقت سوشلزم کا سیلاب تین چوتھائی یورپ، چین اور چند دیگر ممالک پہ چھا چکا ہے اور پوری تُندی کے ساتھ دھاڑتا اور گرجتا ہوا مغرب میں فرانس و بلجیم، اور مشرق میں ہند و برما کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سیاست دان حیران ہیں کہ کیا کریں۔ اور سرمایہ دار سر بگریباں کہ کیونکر بچیں۔ اس مصیبت کا علاج نہ انبیا کے پاس ہے اور نہ یورپ کے پاس۔ اگر ہے تو صرف قرآن کے پاس۔ قرآن کا فیصلہ وہ عظیم الشان فیصلہ ہے کہ سٹالین سن پائے تو اللہ کی قسم قرآن کے سامنے سر بہ سجود ہو جائے۔

کارل مارکس اور اس کے پیرو کہتے ہیں کہ ہر شخص کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ جس دنیا میں سو میں سے ۹۶ انسان بھوک سے مر رہے ہوں۔ دسمبر کے جاڑوں میں عریانی سے ٹھٹھر رہے ہوں۔ مئی اور جون کی لُو میں ہل چلا چلا کر اور پتھر ڈھو ڈھو کر ہلاک ہو رہے ہوں اسی دنیا میں ۴ فی صدی افراد کو عظیم الشان محلوں، موٹروں،

باغوں اور پارکوں میں عیش اُڑانے کا کوئی حق نہیں۔ انھوں نے سرمایہ کے بل بوتے پر غریبوں سے کیوں زمینیں چھینیں۔ اُن کی کمائی پر کیوں ناجائز قبضہ کیا۔ وہ بیسیوں عمارات، کتنی ہزار ایکڑ زمین۔ چار چار پانچ پانچ موٹروں، کتنی درجن گھوڑوں، نہروں اور باغوں پر کیوں قابض ہیں؟ غریب کے پاؤں کانٹوں سے چھلنی ہو چکے ہیں۔ اور ان کے دارالّلباس میں بوٹوں کے بیسیوں جوڑے بیکار پڑے ہیں۔ غریب کے بچے جنوری اور فروری کی برسات میں ٹھٹھر کر جان دے رہے ہیں۔ اور ان کے پاس کمخواب و زربفت کے درجنوں سوٹ الماریوں کی آرائش بنے ہوئے ہیں۔ کسان ہل میں اونٹ کے ساتھ گدھا جوتنے پر مجبور ہو رہا ہے۔ اور ان کے تھانوں پر ناگوری بیلوں کے رسلے یوں ہی بندھے ہوئے ہیں۔ کیا اہلِ سرمایہ کو ان تمام آرائشی اور زائد از ضرورت املاک پہ قابض ہونے کا حق حاصل ہے؟ قرآن کہتا ہے، ہرگز نہیں۔ سنو اللہ کا ازلی اور اٹل فیصلہ۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔

اے رسول لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ مالی قربانی کی حد کیا ہے؟ انھیں کہہ دو کہ ہر زائد از ضرورت چیز خدا و رسول کے سامنے پیش کرو۔

قرآن حکیم کے یہی وہ ازلی۔ غیر متبدّل۔ محکم اور لازوال حقائق ہیں۔ جنھوں نے مفکرین کے ہر طبقے سے خراجِ تحسین حاصل کیا اور جنھوں نے

اِس کتابِ عظیم کو تمام زمانوں کے لیے نسلِ انسانی کا رہبر بنادیا۔ وہ مالک العرش مستقبل کے پردوں سے اُن طوفانوں کو دیکھ رہا تھا، جو قلزمِ افکار کی گہرائیوں میں پرورش پا رہے تھے۔ وہ اُن بجلیوں کی کڑک سن رہا تھا جو کاشانۂ تہذیب پہ کل کو گرنے والی تھیں۔ وہ اُن ہنگاموں کو بے حجاب دیکھ رہا تھا۔ جنھوں نے انسانی گھرانے میں لاکھوں محشر بپا کرلے تھے۔ وہ اُن فتنوں کو دیکھ رہا تھا۔ جنھوں نے ابن آدم کا محاصرہ کرنا تھا۔ اِس لیے اُس نے ایسی ہدایات نافذ کیں کہ بیرونِ قرآن کو کہیں آنچ نہ آنے پائے۔ اور وہ ہر افتاد سے بچتا چلا جائے۔ سبحان اللہ! کیسی مکمّل اور شاندار کتاب ہے!

پختہ سازد حرفِ او ہر خام را ۔۔۔ تازہ غوغائے دہد ایام را
از نمِ او آتش اندر شاخِ تاک ۔۔۔ در کفِ خاک از دمِ او جانِ پاک
بحر و بر از زورِ طوفانش خراب
در پیامِ او شرارِ انقلاب

(اقبال بہ ترمیم)

ہاں! تو ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ اقوالِ رسول اڑھائی سو برس تک کروڑوں زبانوں پہ گھومتے رہے۔ کہیں مجبوراً اضافے ہوئے، اور کہیں عمداً۔ کہیں حافظے سے اُتر گئے۔ اور کہیں انسانی اقوال حضورؐ کی طرف منسوب ہو گئے۔ اور جب امام بخاری کا زمانہ آیا تو ان کی تعداد چودہ لاکھ سے متجاوز ہو چکی تھی۔

دوم آسان اسلام

قرآن کا اسلام بڑا مشکل اسلام ہے۔ یہاں جان و مال کی قربانی کرنا پڑتی ہے۔ مسلمان اللہ کا سپاہی ہے۔ جس کا کام ہر زمانے میں اور ہر مقام پر باطل کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر لڑنا ہے۔ تلواروں کی جھنکاروں میں نعرۂ تکبیر بلند کرنا ہے۔ شمشیر کے سائے میں جنت ڈھونڈنا ہے۔ ہر مصیبت، ہر چوٹ اور ہر افتاد کو مردانہ وار سہنا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ۔ (قرآن)

اللہ تعالیٰ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کے فرمان کی تعمیل میں یوں جم کر لڑتے ہیں، گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

نفس پرستوں نے جب دیکھا کہ یہ اسلام تو ذرا کرخت سا اسلام ہے تو انھوں نے جھٹ ایک نیا اسلام گھڑ لیا جس میں نہ میدانِ جہاد میں جانے کی ضرورت، نہ تکالیف برداشت کرنے کی حاجت۔ اور نہ مالی قربانی کا کوئی جھمیلا۔ قرآن کہتا ہے کہ تلوار کی محبت ایمان ہے:۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ۔ (قرآن)

کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ تم سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ حالانکہ اللہ کو اب تک معلوم نہیں ہوا کہ تم میں سے جہاد کرنے والے کون ہیں اور جنگ کی تکالیف برداشت کرنے والے کون۔

ایک حدیث کہتی ہے۔ کہ بلّی سے محبّت کرنا ایمان ہے۔

حُبُّ الھرۃ من الایمان[1] بلی سے محبّت ایمان ہے۔

(حدیث ۔ المقاصد سخاوی)

اللہ کی راہ میں شہید ہونے سے تو صرف جنّت ملتی ہے۔ لیکن حدیث میں ایسا نسخہ بھی موجود ہے، جس سے ستّر انبیا کے اعمال کا اجر حاصل ہو سکتا ہے۔

من[2] تعلّم بابًا من العلم لیعلم النّاس ابتغاء وجہ اللہ اعطاہ اللہ اجر سبعین نبیًّا۔ — جو شخص کسی طالب علم کو کسی کتاب کا ایک باب ہی فی سبیل اللہ پڑھا دے، تو اللہ اسے ستّر انبیا کا اجر عطا کرتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آسمانوں کے تمام فرشتے تسبیح و تہلیل کا ثواب آپ کے حوالے کر دیا کریں، تو لیجیے یہ گر پلے باندھ لیجیے!

ما[3] من عبدٍ لم تقطر من خلال اصابعہ قطرۃ الّا خلق اللہ ملکًا یسبح للہ بسبعین لسانًا یکون ثواب ذالک — جب کوئی آدمی وضو کرتے وقت پاؤں کی انگلیوں میں خلال کرتا ہے تو پانی کے ہر قطرے پر اللہ ایک فرشتہ پیدا کر دیتا ہے جو ستّر زبانوں میں اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے

---

[1] المقاصد میں علامہ شمس الدین سخاوی اِس حدیث کو وضعی قرار دیتے ہیں۔

[2] تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۱۸ میں محمد طاہر نے اس حدیث کو جھوٹا قرار دیا ہے

[3] " " صفحہ ۱۹ میں اس حدیث کو وضعی قرار دیا گیا ہے۔

التسبیح له الی یوم القیامة (حدیث)

اور اس تسبیح کا ثواب قیامت تک اُس آدمی کو پہنچتا رہتا ہے۔

اِس سے بھی آسان نسخہ لیجیے :

من[1] کتب بسم الله الرحمٰن الرحیم فجوده تعظیماً لله غفر له (حدیث)

جو شخص اللہ کی خاطر بسم اللہ کو خوشخط لکھے اُس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

نہ صرف خود جنّت میں جانے بلکہ دوسروں کو بھی وہاں لے جانے کا گُر حاضر ہے۔

من[2] اذن سنته من نیته صادقة یحشر یوم القیامة فیوقف علیٰ باب الجنّة فیقال له اشفع لمن شئتَ (حدیث)

جو شخص سال بھر کسی مسجد میں سچّی نیت سے اذان دیتا رہے، وہ قیامت کے دن جنّت کے دروازے پہ کھڑا ہو جائے گا۔ اور اسے اختیارات دیئے جائیں گے کہ جس شخص کی چاہے شفاعت کرے۔

مطلب یہ کہ مسجد کے "بانگے" کو کبھی کبھار کچھ کھلا دیا کرو۔ قیامت کے دن قطعاً کوئی نہیں پوچھے گا اور آپ اس کی شفاعت پر جنّت

---

[1] امام سیوطی نے اسے وضعی قرار دیا۔ تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۲

[2] موضوع (تذکرہ صفحہ ۳۶)

میں پہنچ جائیں گے۔

کس مسلمان کا جی نہیں چاہتا کہ وہ حج کرے۔ لیکن اتنا خرچ اور سفر کون برداشت کرے۔ یہ لیجیے گھر بیٹھے بیٹھے حج کر لیجیے۔ وہ بھی ایک نہیں، دو نہیں، بلکہ پورے پچاس۔

من[1] صلّی الفجر فی جماعۃٍ فکانّما حجّ خمسین حجۃً مع آدم	جس شخص نے نماز فجر جماعت کے ساتھ ادا کی۔ اُس نے گویا حضرت آدم کے ساتھ پچاس مرتبہ حج کیا۔

اگر آپ زندگی میں دو چار ہزار بڑے بڑے گناہ کر چکے ہیں تو انھیں معاف کرانے کا طریقہ ہم بتلائے دیتے ہیں۔

من[2] قال لآ اِلٰہ اِلّا اللّٰہ ومدھا ھدمت لہ اربعۃ آلافٍ من الکبائر	جو شخص لمبی سُر سے ایک مرتبہ کلمہ پڑھے اُس کے چار ہزار بڑے بڑے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

بڑے شوق سے گناہ کیے جائیں، زنا کیجیے، شراب پیجیے، جُوا کھیلیے، ڈاکے ڈالیے، جیبیں کاٹیے، تالے توڑیے، اور جھوٹ بولیے۔ اور جب بیس پچیس برس کے بعد جرائم کی تعداد چار ہزار تک

---

[1] یہ حدیث عبداللہ بن احمد کے مجموعہ احادیث سے لی گئی ہے جسے غلط اور محرّف سمجھا جاتا ہے۔

[2] یہ حدیث نعیم کذاب نے تراشی تھی۔ (تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۵۵)

پہنچ جائے، تو "ماہیا" کے سُر میں ایک مرتبہ کلمہ پڑھ دیجیے اور مزے اُڑا لیجیے۔ اس کی بھی ضرورت نہیں، یہ اُمّت ہے ہی بخشی بخشائی۔ اس کا گناہ گناہ ہی نہیں۔

اِنَّ اُمَّتی[1] امۃ مرحومۃ لا عذاب علیہا فی الاٰخرۃ	رسول اللہ فرماتے ہیں کہ میری یہ اُمّت بخشی بخشائی ہے۔ اسے قیامت کے دن عذاب نہیں ملے گا۔

سوم طریقت مشکل اسلام سے بھاگنے والوں کے کئی گروہ تھے۔ جن میں پیر بھی شامل تھا۔ پیر نے جہاد سے جان چھڑانے کے لیے اپنے ھُو حق کے نعروں کو جہادِ اکبر بنا لیا، اور اپنے مسلک پہ احادیث گھڑنا شروع کر دیں مثلاً:

عن[2] حذیفۃ قال سألت النبیّ عن علم الباطن فقال سألت جبریل عنہ فقال سرٌّ بینی وبین احبائی و اولیائی و اصفیائی اودعہ فی قلوبہم لا یطلع علیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل۔	حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے پوچھا کہ علمِ باطن کیا چیز ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ یہی سوال میں نے جبریل سے پوچھا تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ ایک راز ہے جسے صرف اللہ اور اسکے چند اولیا و اصفیا جانتے ہیں۔ نہ کوئی فرشتہ اس راز سے آگاہ ہے اور نہ کوئی پیغمبر۔

---

[1] موضوع ہے (تذکرۃ الموضوعات ص۹۲)

[2] ابن حجر اس حدیث کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ (تذکرۃ الموضوعات ص۱۱)

ایک دن شکار کھیلتے کھیلتے میں ایک مزار کے قریب جا گذرا۔ وہاں ایک گھنے درخت کے نیچے ایک ملنگ بھنگ رگڑ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ ہمارے علم سے پیغمبر بھی بے خبر ہیں۔ اب معلوم ہؤا کہ وہ حدیث بیان کر رہا تھا۔

کبڑی سے کسی نے پوچھا۔ کہ کیا چاہتی ہو۔ تو اچھی ہو جائے، یا سارا جہان تیری طرح بن جائے؟ کہا دوسری بات۔ چونکہ ان پیروں اور فقیروں کی اکثریت دنیوی املاک و امتعہ سے محروم ہؤا کرتی تھی۔ انھوں نے دوسروں کو بھی اپنے جیسا بنانے کے لیے احادیث تراشیں، اور ایک ایک تسبیح پر اتنی نیکیاں تقسیم کیں کہ تمام عالم کے ریاضی دان مل کر بھی انھیں نہ گن سکیں۔

لو یعلم الامیر ما له فی ذکر الله لترك امارته ولو ان ثواب تسبیحه قسم علیٰ اهل الارض لاصاب كلّ واحد منهم عشرة اضعاف الدنیا[1]

اگر ایک بادشاہ کو معلوم ہو جائے کہ ذکرِ خدا میں کتنا لطف ہے تو وہ سلطنت چھوڑ دے۔ اور اگر اس کی ایک تسبیح کا ثواب تمام دنیا پہ تقسیم کر دیا جائے تو ہر شخص کے حصے میں کائناتِ عالم کی تعداد سے دس گنا زیادہ نیکیاں آئیں۔

---

[1] ابو داؤد نخعی کی وضع کردہ (تذکرۃ الموضوعات ص۵۵)

چہارم شاہوں کی خوشامد

سرورِ کائنات صلعم کی رحلت سے چند سال بعد امیر معاویہ اور حضرت علی کا جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ اولی الامر اور خلیفۂ رسول تھے۔ قرآن کے سچے عامل اور رسولؐ کے صحیح پیرو تھے۔ اولی الامر کی اطاعت فرض ہے۔ لیکن معاویہ نے بغاوت کی اور اسلام میں لا انتہا مفاسد کا دروازہ کھول دیا۔ معاویہ کا یہ جرم قابلِ ستائش نہ تھا۔ لیکن اُن کے مدّاحوں نے اُن کی تعریف میں بھی احادیث تراشیں۔

قالؐ رسول اللہ صلعم انت منی یا معاویہ و انا منک۔

رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ اے معاویہ! تُو میرا ہے میں تیرا۔

اس کے جواب میں حضرت علیؓ کے کسی محبّ نے یہ حدیث وضع کر لی:[1]

انا مدینۃ العلم و علیٌ بابھا۔

رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔

تو علی کرم اللہ وجہٗ کا ایک اور پیارا بول اُٹھا:[2]

لِکُلِّ اُمّتہٍ فرعون و فرعون ھٰذہ الامۃ معاویۃ بن

ہر قوم میں ایک فرعون ہُوا کرتا ہے اور اس امت کا فرعون معاویہ بن

---

[1] یہ حدیث جھوٹی ہے (تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۱۰۱)

[2] ترمذی کے ہاں یہ حدیث وضعی ہے (" " صفحہ ۹۶)

[3] جھوٹی حدیث ہے (" " صفحہ ۱۰۱)

بن ابی سفیان۔ ابی سفیان ہے

چونکہ معاویہ کا پایۂ تخت شام میں تھا۔ آپ کے ایک درباری نے شام کی تعریف میں یہ حدیث تیار کر ڈالی۔

قال[1] رسول اللہ صلعم	رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ دنیا کا
الشام صفوۃ اللہ من بلادہٖ	منتخب ترین ملک، ملک شام ہے۔

دورِ امیہ کے بعد عباسیہ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ ان کے مداحوں نے اُن کی تعریف میں احادیث تراشنا شروع کردیں مثلاً:

قال[2] رسول اللہ للعباس	رسول اکرم صلعم نے حضرت عباس کو
اذا کانت سنۃ خمس و	فرمایا کہ ۱۳۵ھ میں خلافت تمہاری،
ثلاثین ومائۃ فالخلافۃ لک	اولاد میں منتقل ہو جائے گی اور تیرے
ولولدک منھم السفاح	بچوں میں سے سفاح، منصور اور مہدی
والمنصور والمھدی۔	خلیفہ ہوں گے۔

خلفائے عباسیہ ۱۳۲ھ میں برسر اقتدار ہوئے تھے، نہ کہ ۱۳۵ھ میں۔ پھر ان کی تعداد ۳۷ تھی۔ جن میں مشہور ترین ہارون و مامون تھے لیکن یہ حدیث تراش تین ابتدائی خلفا کے بغیر کوئی اور نام نہ بتا سکا۔ اس لیے کہ وہ خود خلیفہ مہدی کے زمانے کا آدمی ہوگا۔ اور اس کی غیب دانی مہدی سے آگے نہ چل سکتی ہوگی۔

---

[1] علامہ سخاوی کے ہاں یہ حدیث جھوٹی ہے (المقاصد) (تذکرۃ الموضوعات صفحہ)

[2] موضوع ہے۔ (تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۱)

کہتے ہیں کہ ہارون الرشید کو کبوتر پالنے کا بہت شوق تھا۔ بادشاہ کو کسی چیز کا شوق ہو۔ اور اس پر کوئی حدیث نہ آئے، یہ کیسے ممکن ہے؟ چنانچہ یہ حدیث تیار ہوئی:

ان رسول اللہ، صلعم کان یطیر الحمام۔	رسول اللہ صلعم کبوتر اُڑایا کرتے تھے۔

جب شاہی دربار سے نکلے ہوئے کسی جعلساز تک یہ حدیث پہنچی تو اُس نے جواب میں حدیث ذیل تراش لی:

قال رسول اللہ صلعم ان اللعب بالحمام من عمل قوم لوط۔	رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ کبوتروں سے کھیلنا قوم لوط کا کام تھا۔

(تذکرۃ الموضوعات ص۵۵)

یہود گؤسالہ پرست تھے۔ یہ کسی یہود یا ہندو ہی کی کارستانی معلوم ہوتی ہے کہ گائے کی تقدیس پر حدیث تیار کرا لی۔

اکرموا البقر فانہا سیدۃ البہائم۔ ما رفعت طرفہا الی السماء منذ عبد العجل (تذکرۃ الموضوعات ص۱۵۲)	گائے کی تعظیم کرو۔ اسلیے کہ یہ مویشیوں کی سردار ہے اور جب سے کہ یہودیوں نے (موسےؑ کے زمانے میں) بچھڑے کی پوجا کی تھی یہ بیچاری شرم سے آسمان کیطرف سر نہ اُٹھا سکی۔

ؔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث جھوٹی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہر گائے تاریخ کی ماہر ہوا کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہے کہ موسےٰؑ علیہ السلام کے زمانے میں سامری نے سونے کا گوسالہ تیار کیا تھا۔ جس کی یہود نے پرستش شروع کر دی تھی۔ گناہ یہود نے کیا تھا۔ لیکن شرم گائے کو آ رہی ہے۔ اور شرم بھی اتنی کہ سر تک نہیں اُٹھا سکتی۔ ورنہ اس واقعہ سے پہلے گائے کا سر ہمیشہ آسمانوں کی طرف رہا کرتا تھا۔

یہ تو ہوں گے کوئی یہود کے دوست۔ اب ایک ایسے بزرگ کی حدیث سُنیئے۔ جو یہود کو برداشت ہی نہیں کر سکتے:

قال رسول اللہ صلعم من لم یکن عندہ صدقۃ فلیلعن الیھود۔

جس شخص کے پاس صدقہ کے لیے کوئی چیز نہ ہو، وہ یہودیوں کو گالیاں دے لیا کرے یہی اُس کا صدقہ ہے۔

(تذکرۃ الموضوعات ص ۱۱۲)

یہ مُفسد تو یہ حدیث گھڑ کر جہنم میں چلا گیا۔ لیکن اس کے نتائج آج فلسطین کے عرب بھگت رہے ہے۔ جن یہودیوں کو گالی دینا ہماری تعلیمات کا جزو ہے، وہ آج ہم پہ کیوں رحم کھائیں۔ اگر وہ عربی سلطنتوں پر بم برساتے ہیں، تو وہ کسی حد تک حق بجانب ہیں۔ جب ہم انھیں نجس، ملعون، کشتنی و سوختنی قرار دیتے ہیں، تو وہ ہمیں جواباً کیوں ایسا نہ سمجھیں۔

پنجم فرقہ پرستی

حضرت علیؓ کی زندگی ہی میں دو نئے گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ روافض جو حضرت علیؓ کے حامی تھے اور

خوارج جو مخالف تھے۔ جُوں جُوں زمانہ نکلتا گیا۔ اسلامی فرقوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اور نئے نئے اختلافات پیدا ہوتے گئے۔ ان میں سے تقریباً ہر فرقے نے اپنے عقائد کی تائید اور دوسرے فرقے کی تردید میں احادیث وضع کیں۔ مثلاً شمس الدین سخاوی نے المقاصد میں یہ حدیث درج کی ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلعم القدریۃ مجوس ھٰذہ الامۃ ان مرضوا فلا تعودوھم وان ماتوا فلا تشھدوھم	رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ قدریہ[1] اس امت کے مجوسی ہیں۔ بیمار رہوں تو عیادت پر نہ جاؤ۔ اور مر جائیں تو جنازہ نہ پڑھو۔

اور لطف یہ کہ ہمارے بڑے بڑے امام ان جعلسازوں کے بھرے میں آگئے۔ چنانچہ ترمذی نے عباس کی روایت سے۔ ابن ماجہ نے جابر اور طبرانی نے "الاوسط" میں ابوسعید کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے:

صنفان من امتی لیس لھما نصیب فی الاسلام القدریۃ، والمرجیۃ۔	حضورؐ فرماتے ہیں کہ میری اُمت کے دو فرقوں کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور وہ ہیں قدریہ اور مرجیہ[2]۔

---

[1] قدریہ۔ نظام معتزلہ کے پیرو، جو جبر کے منکر اور انسان کو افعال میں خود مختار سمجھتے تھے۔ (الملل والنحل۔ شہرستانی)

[2] مرجیہ حسن بن محمد حنفیہ کے پیرو۔ جن کا عقیدہ یہ تھا کہ ایمان صرف زبانی اقرار کا نام ہے۔ زبانی اقرار کے بعد ہر شخص جنت میں جائے گا۔ خواہ نیک عمل کرے یا نہ کرے۔ (الفرق الاسلامیہ)

علّامہ محمد طاہر اس حدیث کے وضعی ہونے پہ کئی دلائل پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو تذکرۃ الموضوعات ص۵!

فلاسفۂ یونان کا بنیادی عقیدہ یہ تھا۔ کہ اللہ نے صرف ایک چیز پیدا کی۔ یعنی عقل اوّل۔ عقل اوّل نے فلک اوّل اور عقل دوم پیدا کیے۔ عقل دوم نے فلک دوم و عقل سوم۔ اور یہ سلسلہ عقل دہم تک جا پہنچا۔ جس نے ساری کائنات پیدا کی۔

جب عہدِ ماموں میں فلسفۂ یونان اسلام میں داخل ہُوا۔ اور ہمارے ہاں بھی فلسفی پیدا ہونے لگے۔ جن کی شکلیں اسلامی تھیں اور روح یونانی۔ تو اس فلسفہ کی تائید میں بھی احادیث آنے لگیں۔ مثلاً

قال رسول اللہ صلعم	فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ سب سے پہلی چیز
اوّل ما خلق اللہ العقل[۱]	جو اللہ نے پیدا کی، وہ عقل ہے۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہوں۔ عہدِ عباسیہ میں فلسفۂ یونان اسلام پہ چھا رہا تھا۔ اور ہمارے فلاسفہ و متکلمین ہر چیز کو میزانِ عقل میں تولنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ ہمارے بعض ائمہ کا خیال یہ تھا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ چونکہ کلام اللہ کا وصف ہے۔ اور اللہ کا ہر وصف اللہ کی طرح قدیم ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن مخلوق نہیں۔ بلکہ قدیم ہے۔ فلاسفہ کی سمجھ میں یہ بات کیسے آتی۔ انھوں نے قدامتِ قرآن کا انکار کر دیا۔ اور ماموں نے اُن کی

---

[۱] علّامہ سخاوی اس حدیث کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ (تذکرۃ الموضوعات ص۲۸)

تائید کر دی۔ دوسری طرف امام احمد بن حنبلؒ (وفات ۲۴۱ھ) قدامتِ قرآن کے قائل تھے۔ شاہ و فقیر میں ٹھن گئی۔ اور ابن حنبل کو بے شمار تکالیف کا شکار ہونا پڑا۔ اس سلسلے میں امام کی تائید میں کافی احادیث تیار ہوئیں۔ مثلاً:

قال رسول اللہ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق فمن قال غیر ھذا فاقتلوہ	حضورؐ فرماتے ہیں کہ قرآن غیر مخلوق (قدیم) ہے۔ جو اسے مخلوق کہے اسے مار ڈالو۔
من قال القرآن مخلوق فقد کفر۔	جو شخص قرآن کو مخلوق سمجھے۔ وہ کافر ہے۔

بات سیدھی سی تھی۔ جس پر پوری طرح غور نہ کیا گیا۔ چیزیں دو تھیں۔ وصفِ کلام اور کلام۔ گفتگو کی اہلیت یا وصف الگ چیز ہے۔ اور گفتگو کرنا الگ۔ ہر آدمی وصف کلام (گفتگو کی اہلیت) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن وہ مضامین۔ اشعار اور کتابیں بعد میں لکھتا ہے۔ وصفِ کلام پیدائشی ہے۔ اور کلام یا نتائجِ کلام بعد کی پیداوار۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا وصفِ کلام اللہ کی طرح قدیم ہے۔ لیکن نتائجِ کلام (موسیٰ سے کلام۔ تورات۔ انجیل۔ قرآن وغیرہ) بعد کی پیداوار ہیں۔ اور اس لیے حادث ہیں۔

پیروانِ علیؓ کو عرفِ عام میں شیعہ یا رافضی کہا جاتا ہے۔ یہ فرقہ

سلہ علامہ الصغانی کے ہاں یہ حدیث وضعی ہے۔ (تذکرۃ الموضوعات صفہ)

عہد علیؓ کی پیداوار ہے۔ اس کے متعلق بھی چند احادیث وضع ہوئیں مثلاً

اخبرنی جبریل ان قوماً ینتقصون اصحابی ویذکرونہم بالقبیح مالہم فی الاسلام نصیب۔ قلنا یا رسول اللہ ما اسماءھم۔ قال الرافضۃ الذین رفضوا دینی۔	مجھے جبریل نے بتایا ہے کہ عنقریب ایک ایسا فرقہ پیدا ہوگا، جو میرے صحابہ کو بُرا بھلا کہے گا۔ اور اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہم نے پوچھا اے رسول اللہ! اس کا نام کیا ہے۔ فرمایا۔ رافضہ جو میرے دین کو چھوڑ جائیں گے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ کہ ہندوؤں کو سب سے پہلے محمود غزنوی نے ہندو کہا تھا۔ ورنہ پہلے یہ آریہ کہلاتے تھے۔ ہندوؤں کی کسی مذہبی کتاب میں "ہندو" کا لفظ موجود نہیں۔ اور نہ غزنوی سے پہلے ہندو اہلِ ہند کے معنوں میں کہیں بھی مستعمل ہوتا تھا۔ ہندو کے لفظی معنی ہیں "کالا، غلام، اور چور" چونکہ غزنوی کے خیال میں یہ ہر سہ صفات آریاؤں میں موجود تھیں۔ اس لیے اس نے انھیں ہندو کہہ دیا۔ اور یہ لفظ چل نکلا۔ لیکن ہمارے بزرگوں کا کمال دیکھیے کہ انھوں نے ایک حدیث میں "ہندو" کا لفظ بھی استعمال کر دیا۔ حالانکہ یہ لفظ (اہلِ ہند کے معنوں میں) چار سو سال بعد کی ایجاد ہے۔

لے ابن الجوزی کے ہاں یہ حدیث جعلی ہے (تذکرۃ الموضوعات ص۹۹)

اتقوا[1] الیھود و الھنود — یہودیوں اور ہندوؤں (ہنود کا مفرد ہندو) سے بچو۔

امام ابوحنیفہ (۸۰ھ ۔ ۱۵۰ھ) اور امام شافعی (۱۵۰ھ ۔ ۲۰۴ھ) بعض اجتہادی مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے چنانچہ ان کے پیرو بھی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ اور ایک دوسرے کی تحقیر و تذلیل پر اتر آئے۔ امام ابوحنیفہ کے کسی پیرو نے اس سلسلے میں چند احادیث بھی وضع کیں۔ مثلاً

قال[2] رسول اللہ صلعم سراج امتی ابوحنیفہ — رسول خدا صلعم فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہ میری اُمت کا چراغ ہے۔

احادیث تراشی کا یہ سلسلہ امام ابوحنیفہ کی تعریف تک ہی محدود نہ رہا۔ بلکہ ان بدبختوں نے تہذیب و شرافت کا لبادہ اُتار کر حضرت امام شافعیؒ جیسے عظیم المرتبت مجتہد کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اور گالیوں کو حضورؐ والا صفات کی طرف منسوب کر دیا۔

عن[3] انس قال قال رسول اللہ صلعم سیکون من امتی رجل یقال لہ محمد بن ادریس — حضرت انس رسول اللہ صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ عنقریب میری اُمت میں ایک ایسا شخص آئے گا جس کا نام ہوگا

---

۱ ملاحظہ ہو کلیات آریہ مسافر پنڈت لیکھرام۔

۲ امام سیوطی اس حدیث کی صحت سے منکر ہیں۔ (لآلی سیوطی)

۳ محمد بن طاہر نے اس حدیث کو جعلی قرار دیا ہے (تذکرۃ الموضوعات ص۱۱)

افسر علیٰ امتی من ابلیس۔ (جامع الاصول)
محمد بن ادریس (الشافعی) اور جو میری امت کے لیے شیطان سے بڑھ کر نقصان رساں ثابت ہوگا۔

ششم امتیاز رنگ ونسب

اسلام کا سب سے بڑا مشن رنگ ونسب کے امتیازات کو مٹانا۔ ایرانی و زنگی کا فرق اٹھانا۔ اور انسانی گھرانے میں مکمل مساوات قائم کرنا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں بار بار کہا گیا۔ کہ تم ایک باپ یعنی آدم کے بیٹے ہو۔ تمھارا معبود ایک۔ قبلہ ایک۔ منزل ایک۔ لائحہ عمل ایک، اور میدانِ عمل ایک۔ تم سب کائنات کے خادم ہو۔ اور تمھارا رسول سارے جہان کے لیے رحمت۔ تم سب سے محبت کرو۔ ان کی کتابوں اور رسولوں پہ ایمان لاؤ۔ کسی کو بُرا نہ کہو۔ اور کشتِ آدم پر سدا رحمت بن کر برستے رہو۔ لیکن بھلا نہ ہو ہمارے مُلّا کا۔ اُس نے سرورِ کائنات صلعم کے مشن کو ناکام بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ ایرانی وعربی کے جھگڑے اُٹھائے۔ زنگی و نورانی کے فتنے کھڑے کیے۔ بھائی کو بھائی سے لڑایا۔ اور مسلمان کو ایک تنگ نظر، متعصب، کج دماغ، اور موذی قسم کا مذہبی دیوانہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اس میں کلام نہیں کہ البرامکہ کے عہدِ وزارت میں ایرانی اقتدار بہت بڑھ گیا تھا۔ لیکن آخر وہ بھی مسلمان تھے۔ بے حد قابل تھے۔ اُن کے مفکرّ دنیائے افکار میں انقلاب اُٹھا رہے تھے۔ اُن کے منجم

آسمان کی باتیں اہلِ زمین کو سُنا رہے تھے۔ اُن کے فلاسفہ حقائقِ زندگی کو سبلے حجاب کر رہے تھے۔ اُن کے اہلِ قلم عربی ادب میں نئی روح بھر رہے تھے۔ اُن کے سیاست دان نظامِ سلطنت کو حیاتِ نو عطا کر رہے تھے۔ اگر وہ اپنی ذہنی صلاحیت۔ زورِ قلم۔ شاندار فلسفہ اور بے پناہ علوم و فنون کی بدولت مزاجِ شاہی میں راہ پا گئے تھے تو عربوں کو خوش ہونا چاہیئے تھا۔ کہ اُن کی لگائی ہوئی پود آج رشکِ چمن بن کر ایک دنیا کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔ نہ کہ ناخوش۔ لیکن چونکہ مُلّا کسی دَور میں بھی نہ حقائق کو دیکھ سکا۔ اور نہ سمجھ سکا۔ اس لیے اس نے تمیزِ نسل و رنگ کے دبلے ہوئے فتنوں کو پھر جگانے کی کوشش کی۔

قال رسول اللہ صلعم[1] ابغض الکلام الی اللہ الفارسیۃ کلام الشیطان الخوزیۃ و کلام اھل النار البخاریۃ وکلام اھل الجنۃ العربیۃ	حضورؐ فرماتے ہیں کہ اللہ کو سب سے زیادہ نفرت فارسی سے ہے خوزیہ (خوزستان کی زبان) شیطان کی زبان ہے۔ بخارا کی بولی دوزخیوں کی بولی ہے اور اہلِ جنّت عربی میں گفتگو کیا کریں گے۔

اب ذرا ان جعلسازوں کی نوازشات اہلِ افریقہ پہ ملاحظہ کیجیے

الزنجیؒ[2] اِذَا شبع زنیٰ و	حبشی (حبشہ کا رہنے والا) کا پیٹ بھر جائے

[1] ائمہ فن نے اس مضمون کی تمام احادیث کو وضعی قرار دیا ہے (تذکرۃ الموضوعات ص۱۳)

[2] عرب کے بغیر سارا جہان عجم کہلاتا ہے۔ لیکن اصطلاحاً اس سے مراد صرف ایران ہے۔

اِنْ جَاعَ سَرَقَ ۔ تو وہ زنا کرتا ہے۔ اور اگر بھوکا ہو تو چور بن جاتا ہے ۔

شہر یار مدینہ کے پیارے مؤذن سیدنا حضرت بلالؓ (حبشہ کے رہنے والے) اس حدیث کو سن پاتے تو کیا کہتے ۔ ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے (غالبؔ)

ہفتم ملا در مدح خود میگوید

حضورؐ کا قول ہے کہ میرے بعد خیر کم ہوتا جائے گا اور شر بڑھتا جائیگا۔ یہاں تک کہ ایک ایسا زمانہ آجائے گا جب :۔

وعلماءُھم شَرٌّ من تحت ادیم السماءِ اس اُمت کے مُلاّ خیمۂ افلاک کے نیچے بدترین مخلوق تصور ہوں گے ۔

جب ہمارے مُلاّؤں نے دیکھا۔ کہ کچھ تو اس قول کی وجہ سے اور کچھ اپنی نالائقی ۔ تنگ نظری۔ کج دماغی اور اندھے تعصب کی بنا پر ان کی منزلت ہر جگہ کم ہو رہی ہے تو انھوں نے اپنے ڈوبتے ہوئے سفینے کو بچانے کے لیے احادیث تراشنا شروع کر دیں ۔

اپنی زیارت کے متعلق فرماتے ہیں[1] :

قال رسول اللّٰہ صلعم من حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جس شخص نے

---

[1] اس عنوان کے تحت دی ہوئی تمام احادیث ائمہ فن کے ہاں جھوٹی ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۱۹ ۔ ۵۰ ۔ ۲۱ ۔

زائر العلماء کانما زارنی	کسی عالم کی زیارت کی، گویا میری زیارت
من صافح العلماء کانما صافحنی	کی اور جس نے کسی عالم سے ہاتھ ملایا گویا مجھ سے ہاتھ ملایا۔

اپنی مجلسوں کو پر رونق بنانے کے لیے عوام کو یوں حکم دیا۔

حضور مجلس عالم افضل من صلوٰۃ الف رکعۃ و عیادۃ الف مریض وشهود الف جنازۃ۔	حضور فرماتے ہیں کہ کسی عالم کی مجلس میں حاضری بھرنا۔ ہزار رکعت نماز، ہزار مریضوں کی عیادت اور ہزار جنازوں میں شامل ہونے سے بہتر ہے۔

مُلّا کو خطرہ تھا کہ کہیں وہ منصب قیادت سے محروم نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ نبی بن بیٹھا، کہ لوگ اس کی منزلت کو کتنا ہی کم کریں، آخر اسے مذہبی رہنما تو تسلیم کریں گے۔

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔	میری اُمت کے عالم انبیائے بنی اسرائیل یعنی حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ وغیرہ علیہم السلام سے کم نہیں۔
الشیخ فی قومہ کالنبی فی اُمتہ۔	ایک مُلّا کو اپنی قوم میں وہی مقام حاصل ہے جو ایک نبی کو اپنی اُمت میں۔

اللہ کے ہاں شہادت بلندترین اعزاز ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔ اس لیے کہ یہ نعمت کسی چال سے نہیں، دولت سے نہیں۔ سفارش سے نہیں۔ عمر بھر کی عبادت سے نہیں۔ مساجد بنوانے اور چاہ کھدوانے سے نہیں۔ بلکہ اللہ کی

راہ میں سر دے کر موت کے گرجتے ہوئے طوفان سے اُلجھ کر، جنگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں کود کر، اور دھاڑتی ہوئی توپوں کے دہانوں میں داخل ہو کر حاصل کی جاتی ہے۔ اور جو جنس اس قدر بھاری قیمت دے کر خریدی جائے وہ لازماً قیمتی ہونی چاہیئے۔ اسی لیے تو حضورؐ فرمایا کرتے تھے:

"میری یہ آرزو ہے، کہ مَیں اللہ کی راہ میں لڑتے لڑتے شہید ہو جاؤں۔ پھر زندگی ملے، پھر شہید ہو جاؤں۔ سہ بارہ زندگی ملے اور سہ بارہ شہادت حاصل کروں"۔ (بخاری)

حضرت خالد بن ولید کا آخری وقت قریب آیا، تو رو کر کہنے لگے:

"کئی جنگوں میں شامل ہُوا، پورے ایک سو زخم جسم پہ کھائے اور پھر بھی اللہ نے مجھے شہادت سے محروم رکھا"۔ ہر صحابی ہر نماز کے بعد دُعا کیا کرتا تھا۔ کہ "اے اللہ! میری اِس فانی زندگی کا انجام شہادت ہو"۔

ہمارے مُلّا نے جب دیکھا۔ کہ یہ میدانِ جنگ والی شہادت تو سر دے کر میسّر آتی ہے، تو اس نے شہادت کے نہایت آسان آسان نسخے ڈھونڈ لیے۔ مثلاً

مداد العلماء افضل من دم الشہداء	عالم کی سیاہی شہید کے لہو سے افضل ہے۔

اِس سے پہلے تو ہمارے سہل پسند کہا کرتے تھے ؏

لہو لگا کے شہیدوں میں نام کر لیں گے۔

لیکن اب یہ کام سہل تر ہو گیا ۔ مسجد میں گئے ۔ ملّا کی دوات سے سیاہی نکال کر مُنہ پر مل لی اور شہید بن گئے ۔

مُلّا ۔ داڑھی ۔ مسواک ۔ حلوا ۔ مُرغا ۔ ضیافت اور صدقہ لازم و ملزوم ہیں ۔ ان لوازمات کے بغیر ہم مُلّا کا تصوّر ہی نہیں کر سکتے ۔ خطرہ تھا ۔ کہ کہیں آپ مرغ و حلوہ پکا کر خود ہی نہ کھا جائیں ۔ اس لیے حضرت مولانا نے اِن " اہم مسائل " پر کئی احادیث پیش فرمائیں ۔

مسواک

السواك يزيد الرجل فصاحة ۔ — رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ مسواک سے فصاحت بڑھتی ہے

چونکہ فصیح کلام مُنہ سے نکلتا ہے اور مسواک بھی مُنہ میں کیا جاتا ہے ۔ اس لیے مولانا اس " سائنٹیفک نتیجے " پر پہنچے کہ مسواک اور فصاحت و بلاغت کا ضرور کوئی نہ کوئی تعلق ہے ۔

داڑھی

اعتبروا عقل الرجل فی طول لحيته — داڑھی جتنی لمبی ہو ؛ عقل اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے ۔

گو داڑھی مُنہ پہ ہوتی ہے ۔ اور عقل کا مرکز دماغ ہے ۔ لیکن مولانا کا خیال یہ ہے کہ اس کھیتی کو عقل کے چشمے سے پانی ملتا ہے ۔ اس لیے عقل کے چشمے میں پانی جتنا زیادہ ہوگا ۔ داڑھی اتنی ہی لمبی ہوتی جائے گی ۔

اِسی قِسم کی ایک اور حدیث ہے کہ

لا دین لمن لا عقل لہ — جس کے پاس عقل نہیں، وہ بے دین ہے۔

عقل کا معیار ہے ڈاڑھی۔ تو گویا ڈاڑھی منڈے سب کے سب احمق اور بے دین ٹھہرے۔ ان کے لیے جنّت میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن ایک اور حدیث ہے کہ

اکثر اھل الجنّۃ البلہ — کہ جنّت میں زیادہ تعداد احمقوں کی ہو گی۔

صدقہ

قال رسول اللہ صلعم اوّ والزکوٰۃ وبخروبھا اھل العلم — حضور صلعم فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ علما کو دیا کرو۔

حلوا

کان النبی یحب الحلوا و العسل۔ — رسول اللہ صلعم کو حلوا اور شہد بہت پسند تھے۔

قلب المومن حلو د یحب الحلاوۃ و من حرمھا علیٰ نفسہٖ فقد عصی اللہ و رسو لہ — مومن کے دل میں مٹھاس ہوتی ہے اور اسی لیے وہ حلوے کو پسند کرتا ہے۔ جو شخص حلوہ نہیں کھائے گا وہ خدا اور رسول کا نافرمان شمار ہوگا۔

من لقم اخاہ لقمۃ حلوا صرف اللہ بھا عنہ حرارۃ الموقف یوم القیامۃ

جو شخص اپنے بھائی کو حلوے کا ایک لقمہ کھلا دے گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے عرصۂ محشر کی گرمی سے بچا لے گا۔

علیکم بالعسل والذی نفسی بیدہ ما من بیت فیہ عسل الا و یستغفر لہ ملائکۃ ذالک البیت وان مات وھو فی جوفہ لم تمس النار جلدہ۔

حضور فرماتے ہیں کہ شہد کھایا کرو، خدا کی قسم جس گھر میں شہد موجود ہو اُس گھر کے فرشتے گھر والے کی مغفرت کے لیے سدا مصروف دعا رہتے ہیں۔ اور اگر شہد کھانے کے بعد وہ مر جائے تو آگ اُس کے جسم کو نہیں چھو سکتی۔

مرغا

الدیک الابیض صدیقی وصدیق صدیقی جبریل۔

سفید مرغا میرا بھی دوست ہے اور میرے حبیب جبریل کا بھی

من اتخذ دیکا ابیض حفظہ اللہ من شر شیطان وکاھن و ساحر۔

جو شخص سفید مرغا پالے گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے شیطان۔ کاہن اور جادوگر کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

کہتے ہیں کہ کالے رنگ کا مرغا گرم ہوتا ہے اور اُسے کھانے کے بعد پیچش کا ڈر رہتا ہے۔ اس لیے مولانا نے سفید مُرغا پالنے کی ہدایات نافذ فرمائیں۔

خضاب

ہمارے مُلّا عموماً ڈاڑھی کو خضاب لگایا کرتے ہیں۔ خضاب خریدنا اور لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ کب کوئی آدمی مرے۔ مُلا صاحب جنازے کی فیس وصول کریں۔ اس میں سے دو آنے بچا کر بازار جائیں۔ خضاب لائیں۔ اسے گھولیں۔ لگائیں اور خشک ہونے تک ایک مقام پر بندھے رہیں۔ خضاب لگاتے وقت اتنی منازل طے کرنا پڑتی تھیں۔ اِس لیے مولانا نے اِس نہایت مشکل کام کا صلہ بھی نہایت موزون مقرر کیا ہے۔

نفقۃ الدرھم فی سبیل اللّٰہ بسبعمأۃ ونفقۃ درھم فی خضاب لسبعۃ الاف

اللّٰہ کی راہ میں ایک درہم خرچ کرنا سات سو درہم کے برابر ہے۔ لیکن خضاب پہ خرچ کیا ہوا ایک درہم سات ہزار کے برابر۔

حُسن پرستی

کون ہے جو حسن پرست نہیں۔ لیکن مقیمانِ مسجد و مکتب میں یہ جذبہ ضرورت سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ مرغن ضیافتیں کھانے کے بعد جنسی میلان بڑھ جاتا ہے۔ اور ہوتے ہیں یہ لوگ عموماً مجرّد، اور بظاہر پارسا۔ تسکینِ جنس کے وسائل نایاب و کمیاب۔ اس لیے یہ باتوں ہی سے دل خوش کر لیتے ہیں۔ احادیثِ ذیل اِن ہی دبی ہوئی خواہشات کا نتیجہ ہیں:

النظر[1] الی المرأۃ الحسناء یزید فی البصر
خوش شکل عورت کی طرف دیکھنے سے نظر بڑھ جاتی ہے۔

قال رسول اللہ صلعم علیکم بالوجوہ الملاح والحدق السود فان اللہ یستحیي ان یعذب وجھا ملیحًا بالنار۔
رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں نمکین چہروں اور سیاہ آنکھوں سے محبت کیا کرو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی صبیح چہرے کو آگ کا عذاب نہیں دے گا۔

ششم حقائق حیات

عہدِ عباسیہ میں جب علم الحقائق مثلاً علم نباتات۔ جمادات۔ ریاضیات۔ السنہ۔ افلاک وغیرہ اسلامی ادب میں راہ پانے لگا، تو مُلّا نے سوچا کہ کہیں یہ علمائے طبیعی بازی نہ لے جائیں۔ اس لیے اس نے بھی حقائقِ حیات پر اپنے مخصوص رنگ میں روشنی ڈالنا شروع کر دی۔ گلاب کے پھول کی ماہیّت سے یوں پردہ اُٹھاتے ہیں:

انّ الورد[2] من عرق النبی صلی اللہ علیہ وسلم او من عرق البراق۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ یا براق کا پسینہ زمین پر گرا اور گلاب کا پودا پیدا ہو گیا۔

کیا غضب کی تحقیق ہے۔ جی چاہتا ہے کہ علم نباتات کا سارا دفتر

---

[1] سخاوی کے ہاں یہ دونوں احادیث وضعی ہیں۔ (مقاصد تذکرۃ الموضوعات ص۱۶۲)

[2] " " " " " " (" ص۱۶۱)

اٹھاکر اس جھوٹے کے سر پر دے ماریں۔ کوئی پوچھے کہ کیا حضورؐ کی ولادت سے پہلے گلاب کا پودا دنیا میں موجود نہیں تھا۔ اگر نہیں تھا، تو بقراط نے (جو ولادت مسیحؑ سے بھی صدیوں پہلے تھے) اپنی کتابوں میں گلاب کے عرق اور پھول کا ذکر کیسے کر دیا۔ اور بحر الکاہل کے بعید ترین جزائر میں یہ پودا کیسے پیدا ہو گیا؟

گندم کے متعلق فرماتے ہیں:

شرار امتی الذین	میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں
یاکلون الحنطۃ	جو گندم کھاتے ہیں۔

گندم نے حضرت آدمؑ کو جنت سے نکلوایا تھا۔ اس لیے اس ظالم غلے پر مولانا کا غصہ برمحل ہے۔

قرآن حکیم میں ایک آیت ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ	ہم ہر نبی کو اس کی قوم کی زبان میں
اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ۔	پیغام دیا کرتے ہیں۔

ہمارے مولانا اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں:

قال[2] رسول اللہ صلعم	رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں۔ اس اللہ کی
والذی نفسی بیدہ ما انزل	قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔
اللہ من وحی قط علیٰ نبی	کہ ہر نبی پر وحی عربی زبان میں اترتی

---

[1] حدیث وضعی ہے۔ (تذکرۃ الموضوعات ص ۱۵۱)

[2] علامہ محمد طاہر کہتے ہیں کہ سلیمان بن ارقم جیسا کذاب اس کا راوی ہے (تذکرۃ الموضوعات ص ۱۱)

إلّا بالعربی ثم يبلّغه بلسان قومه — تھی، اور پھر وہ اُسے اپنی زبان میں ڈھال کر قوم تک پہنچاتا تھا۔

مولانا نے یہ حدیث تراشنے سے پہلے دو مفروضے قائم کر لیے تھے۔

اوّل - کہ ہر نبی خواہ وہ چین میں آیا تھا یا ہندوستان میں، عربی زبان کا ماہر ہُوا کرتا تھا۔ ورنہ وحی کو سمجھتا کیسے؟

دوم۔ کہ عربی زبان تخلیقِ انسان کے ساتھ ساتھ چلی آتی ہے حالانکہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ کہ عربی، عبرانی۔ آرامی۔ فینیقی۔ آشوری اور دیگر سامی زبانیں ایک ایسی زبان سے نکلی تھیں۔ جو مدّت مدید سے مٹ چکی ہے۔ اس ابتدائی زبان کی قدیم ترین شاخیں عبرانی و آرامی تھیں۔ عربی ان سے بعد معرضِ وجود میں آئی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف برطانیکا۔ بر بہ عنوان "سامی زبانیں"

تو جو زبان دنیا میں موجود ہی نہیں تھی۔ اس میں آدمؑ و نوحؑ کی طرف وحی بھیجنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی تھی؟ کیا اللہ ان انبیاء کی زبانوں سے نا آشنا تھا؟ یا اُن میں وحی بھیجنا اُس کی توہین تھی؟ ؎

کوّے کی دُم میں ٹانکی کرن آفتاب کی
جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی!!

ماحصل ماحصل یہ کہ کہیں احادیث حافظہ سے اُتر گئیں کہیں بادشاہوں کی خوشامد۔ اور نئے نئے عقائد کی تصدیق کے لیے احادیث وضع کی گئیں۔ کہیں نسلی بغض اس جرم کا محرک بنا کہیں

جہاد سے جان چھڑانے۔ اپنی شان بنانے اور مسلکِ طریقت کو اچھالنے کے لیے یہ حرکت کی گئی۔ اور رفتہ رفتہ احادیث کا وہ طومارِ عظیم جمع ہو گیا۔ کہ صحیح و غلط میں تمیز محال ہو گئی۔

سوال بعض حضرت کہتے ہیں کہ تم صحیح و غلط کی اُلجھن میں کیوں پڑے ہو۔ جو حدیث قرآن کے مطابق ہے، وہ لے لو۔ اور باقی سب کو مسترد کر دو۔

جواب اس سوال کے کئی جواب ہیں۔ اوّل۔ جو حدیث قرآن کے مخالف ہے۔ وہ ہر طبقہ کے ہاں مردود ہے۔ اور جو قرآن کے موافق ہے۔ اُس کی ضرورت[1] ہی نہیں۔ اِس لیے کہ قرآن کافی ہے۔

دوم۔ آپ کی اس تجویز کی بنیاد ایک وضعی حدیث پر ہے۔

اذا[2] روی عنی حدیث	جب مجھ سے کوئی روایت کی جائے
فاعرضوہ علی کتاب اللہ فان	تو اِس کا مقابلہ قرآن سے کرو۔
وافقہٗ فاقبلوہ وان خالفہ	اگر قرآن کے مطابق ہو تو مان لو۔
فردوہ۔	ورنہ مسترد کر دو۔

بعض جعلساز اس سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

قال رسول اللہ صلعم اذا	رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ جب

---

[1] یہ جواب محض منطقیانہ اور سخن گسترانہ ہے اس موضوع پر محققانہ بحث آگے آئیگی۔ (مصنف)

[2] یہ ہر دو احادیث علامہ عقیلی خطابی اور صغانی کے ہاں وضعی ہیں (تذکرۃ الموضوعات ص ۲۸-۲۷)

حدثتم عنی بحدیث یوافق الحق فصدقوہ وخذوا بہ حدثت بہ اولم احدث	تمھارے سامنے کوئی ایسی حدیث پیش کی جائے جو حقیقت کے مطابق ہو تو اُسے قبول کر لو۔ خواہ میرا قول ہو یا نہ ہو۔

مطلب یہ کہ اگر کوئی زنِن سنگھ یہ کہہ دے کہ دو اور دو چار بنتے ہیں اور اسے رسول کی طرف منسوب کر دے، تو قبول کر لو۔ اس لیے کہ یہ قول خلافِ حقیقت نہیں۔

بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ یہ تجویز بڑی تہیں، لیکن اس راہ میں بھی بڑی مشکلات ہیں۔ اس لیے کہ بعض ایسی احادیث بھی جو تعلیم قرآن کے عین مطابق اور حدیث کی اہم کتابوں میں شامل ہیں۔ محققین کے ہاں جعلی ہیں۔ مثلاً

حدیث	کس نے وضعی قرار دیا	حوالہ
(۱) الایمان عقد بالقلب واقرار باللسان وعمل بالارکان۔ (ایمان کیا ہے۔ دل سے تصدیق۔ زبان سے اقرار اور اعضا سے عمل)	امام ابن جوزی	تذکرۃ الموضوعات ص۱۱
(۲) طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم		

(علم کی تلاش ہر مسلم پہ فرض ہے)	ابن راہویہ۔ سخاوی ابوعلی نیشاپوری اور بیہقی	تذکرۃ الموضوعات صـ۱۷
(۳) اطلبوا العلم ولو کان بالصین (تلاش علم میں چین تک جاؤ)	ابن عدی۔ ابن الجوزی سیوطی۔ ابن حیان۔ بیہقی	" صـ۱۷
(۴) کنت کنزاً مخفیاً لاعرف فاحببت ان اعرف فخلقت خلقاً فعرفتہم بی فعرفونی (میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ چاہا کہ عیاں ہو جاؤں۔ تو میں نے انسان پیدا کیا۔ میں نے اُسے معرفت کے راستے بتائے۔ چنانچہ اُس نے مجھے پا لیا۔	امام ابن تیمیہ الزرکشی	" صـ۱۱
(۵) من عرف نفسہٗ عرف ربہٗ (جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اُس نے گویا خدا کو پہچان لیا)	ابن تیمیہ	" صـ۱۱
(۶) من سر المومن فقد سر اللہ (جس نے کسی مومن کو خوش کر لیا اُس نے گویا اللہ کو خوش کر لیا)	ا سیوطی	صـ۱۴

ائمہ فن کی تصانیف میں اس طرح کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ کہ حدیث کا مضمون درست۔ تعلیم قرآن کے عین مطابق۔ اور پھر بھی غلط۔ اب فرمایئے! احادیث کو جانچنے کے لیے پیمانہ کہاں سے لائیں؟

ساتواں باب

موطا پر ایک نظر

امام مالک بن انس (۹۳ھ۔۱۷۹ھ) نے جب پہلی مرتبہ موطا مدّون کیا، تو اس میں دس ہزار احادیث درج تھیں۔ بعد میں اس پر نظر ثانی کی تو آٹھ ہزار سات سو اسی احادیث مشکوک نظر آئیں۔ انھیں نکال لیا اور صرف ایک ہزار سات سو بیس رہنے دیں۔ اُنھوں نے انتخاب احادیث کے لیے کون سا معیار استعمال کیا۔ ہم نہیں جانتے۔ اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں۔ کہ امام مالک کا کردار تقدس اور خلوص تمام شبہات سے ڈانز تھا۔ اور یہ کہ اُنھوں نے صحیح کو غلط سے جدا کرنے کے لیے تمام انسانی ذرائع استعمال کیے ہوں گے۔ لیکن پونے دو سو برس کا عرصہ گذر چکا تھا۔ احادیث بڑھتے بڑھتے اور بگڑتے بگڑتے کیا سے کیا بن چکی تھیں۔ اس ذخیرے میں سے قول رسول کو تلاش کرنا۔ اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ ہم موطا کی تعظیم ضرور کرتے ہیں۔ لیکن وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے مندرجات واقعی اقوال رسول ہیں۔ اور خصوصاً ان حالات میں کہ اس کی بعض روایات محلّ نظر ہیں۔ مثلاً موطا[1] میں درج ہے۔ کہ نیند سے بیدار

---

[1] طبع مجتبائی ۱۳۰۷ھ ص ۳۱

ہونے کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے وضو ضروری ہے۔ اور اذا قمتم الی الصّلوٰۃ کی تفسیر لے من المضاجع یعنی النوم دی ہوئی ہے۔

لیکن صحیح بخاری (کتاب الوضو) میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے یہ حدیث دی ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلعم رات کو جاگے۔ صلوٰۃ تہجد ادا کی۔

ثمّ اضطجع ونام حتّی نفخ ثم اتاہ المنادی فقام معہ الی الصلوٰۃ فصلّی ولم یتوضّا۔	پھر بستر پر دراز ہو گئے۔ پھر سو گئے یہاں تک کہ خراٹوں کی آواز آنے لگی اس کے بعد نماز کے لیے بلانے والا آیا۔ آپ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیے اور وضو کیے بغیر نماز پڑھ لی۔

چند اور اقوال ملاحظہ ہوں۔ عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے:

من قبل امرأتہ او جسّہا بیدہ فعلیہ الوضو (موطا ص ۳۳)	جو شخص اپنی بیوی کو چوم لے یا صرف چھو لے۔ اس پر وضو لازم ہو جاتا ہے۔

لیکن اسی صفحہ پر یہ حدیث بھی موجود ہے۔

من عائشۃ ان النبی قبل بعض نسائہ ثمّ خرج الی الصلوٰۃ ولم یتوضا	حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے اپنی ازواج میں سے کسی کے بوسے لیے اور پھر وضو کیے بغیر نماز ادا فرمالی

صحیح مسلم (جلد اوّل مع فتح الملہم طبع مجتبائی ص ۴۸۵) میں درج ہے۔

عن ابی بن کعب قال سألتُ رسول اللہ صلعم عن الرجل یصیب من المرأۃ ثم یکسل قال یغسل ما اصابہ من المراۃ ثم یتوضاء و یصلی ۔

ابی بن کعب کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلعم سے ایک ایسے شخص کے متعلق فتویٰ پوچھا کہ جو اپنی بیوی کے پاس بغرض مجامعت گیا۔ کام شروع کیا لیکن انزال سے پہلے ہی اسکی شہوت ختم ہو گئی۔ فرمایا۔ وہ تمام نجاستوں کو دھولے اور پھر وضو کرکے نماز پڑھ لے۔

مزید تشریح کے لیے اسی صفحہ کی اگلی حدیث دیکھیے :

انّ رسول اللہ صلعم قال فی الرجل یاتی اھلہٗ ثم لا ینزل قال یغسل ذکرہٗ ویتوضا ۔

(مسلم ص۱۴۸)

ایک ایسے شخص کے متعلق جس نے اپنی بیوی سے مجامعت کی لیکن انزال سے پہلے ہی علیحدہ ہو گیا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ وہ شخص آلۂ تناسل دھو کر وضو کر لے۔

اسی مسئلہ پر اب موطا کا فیصلہ سُنیئے :

عن ابی سلمۃ بن عبد الرحمٰن بن عوف قال سألت عائشۃ ما یوجب الغسل قالت ..... اذا جاوز الختان الختان فقد وجب الغسل ۔

(ملخص موطا ص۱۶)

ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن بن عوف کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کس صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے ... فرمایا جب آلۂ تناسل[1] کا سر عورت کی شرمگاہ کے ابتدائی حصے میں داخل ہو جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔

---

[1] اصل الفاظ ہیں اذا جاوز الختان الختان۔ مرد کی صورت میں ختان کے معنی ہونگے "آلۂ تناسل کا ختنہ شدہ" اور عورت کی صورت میں "شرمگاہ کا حصہ"۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے۔ کہ اُس زمانے میں سینکڑوں صحابہ مدینے میں موجود تھے۔ اور عبد الرحمٰن بن عوف خود بھی فقیہہ صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ اِس موضوع پر احادیث بھی لوگوں کو یاد ہوں گی۔ بایں ہمہ ابو سلمہ نے یہ کمال کیا کہ ایک نہایت نازک سا مسئلہ حضور علیہ السلام کی سب سے کم عمر زوجۂ مطہرہ سے جا پوچھا۔ کیا مدینہ بھر میں اس چھوٹی سی بات کو بتانے والا کوئی مرد موجود نہیں تھا؟ کیا کوئی غیر مرد کسی معزز خاتون سے اِس قسم کی بات دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ابو سلمہ یہ غلطی کر بیٹھے تھے، تو حضرت عائشہ رض کو چاہیے تھا، کہ اُن کو اس جسارت پر ڈانٹتیں، کہ تم کو حرم نبوی سے ایسا سوال پوچھنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ یا خاموشی اختیار فرما لیتیں۔ اور اگر خواہ مخواہ کوئی جواب دینا ہی تھا تو کنایہ و استعارہ سے کام لیتیں۔ "یہ آلہ تناسل کا شرمگاہ میں داخل ہونا"، ایسے الفاظ ہیں، جو ایک خاتون اپنے شوہر کے سامنے بھی منہ سے نہیں نکال سکتی چہ جائیکہ غیر مردوں کے سامنے۔

چونکہ یہ حدیث ہمارے مشاہدہ۔ عام تجربہ عورت کی مسلمہ کیفیات نفسی اور حضرت عائشہ رض کے بلند مقام سے متصادم ہو رہی ہے نیز صحیح مسلم کی دو احادیث اس کی تردید کر رہی ہیں۔ اس لیے ہم اِس نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں، کہ اس قول کو حضرت عائشہ رض کی طرف منسوب کرنا درست نہیں۔ میری اس رائے پہ حدیث پرست علماء چیخ اُٹھیں گے

کہ تو کون ہوتا ہے امام مالک کی حدیث کی تردید کرنے والا۔ ایاز قدرِ خود شناس، اس حدیث کے فلاں فلاں راوی ہیں۔ جن کے متعلق ابن ذہبی۔ ابن معین اور خدا جانے کس کس نے لکھا ہے کہ نہایت معتبر اور نیک لوگ تھے۔ اور تم جیسا جاہل کہتا ہے کہ حدیث غلط ہے۔ میں ان علما کی خدمت میں قبل از وقت عرض کر دوں۔ کہ عصرِ حاضر کا انسان یہ نہیں دیکھتا، کہ کہنے والا کون ہے۔ بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ کہا کیا ہے؟ راوی راوی کا شور مچائے جانا، اور یہ نہ دیکھنا کہ روایت نے حقیقت کو کتنا صدمہ پہنچایا۔ نبی اور حرمِ نبوی کی منزلت کو کتنا دھکا لگا یا۔ پیروانِ اسلام کے دل میں کتنے شبہات پیدا کیے۔ اور دشمنانِ اسلام کو اسلام پہ ہنسنے کے کتنے مواقع بہم پہنچائے ہیں۔ ایک مُلّا ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ مُلّا کہتا ہے کہ میری حدیث کا ہر ہر لفظ محفوظ رہے۔ اسلام رہے یا نہ رہے۔ حضور کی منزلت زیادہ ہو یا کم۔ لوگ اسلام پہ ہنسیں یا روئیں، میری بلا سے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم حدیث کے نیچے دبے ہوئے قرآن کو نکالیں۔ اور اہلِ عالم کے سامنے ایک مرتبہ پھر اعلان کریں۔

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ج

(کہ یہ کتاب تمام شبہات سے وراء الورا ہے)

لیلۃ القدر کی تلاش

مسلمانوں کے ہر طبقے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ رمضان کے آخری ہفتے

ہیں ایک رات "لیلۃ القدر" کہلاتی ہے۔ اس کی خاص علامات یہ ہیں کہ زمین و آسمان بقعۂ نور بن جاتے ہیں۔ کائنات کی ہر چیز سجدے میں گر جاتی ہے۔ اور اُس وقت جو دعا بھی مانگی جائے، قبول ہو جاتی ہے
اس رات کی تلاش میں ہمارا ایک طبقہ ہفتہ بھر جاگتا رہتا ہے۔ اور ان میں سے بعض اپنی کامیابی کے فرضی افسانے بھی گھڑ لیا کرتے ہیں۔
اِس میں کوئی کلام نہیں کہ قرآن حکیم میں لیلۃ القدر کا ذکر آیا ہے۔
اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ہم نے یہ قرآن لیلۃ القدر یعنی فیصلہ کن رات میں اتارنا شروع کیا۔

لیکن وہ لیلۃ القدر، حدیث والی لیلۃ القدر سے الگ چیز ہے
اُس کا مفہوم ہے ایک فیصلہ کن رات یعنی حق و باطل کے جھگڑے کو چکا دینے والی اور قیاصرہ و اکاسرہ کی تقدیر کا فیصلہ کر دینے والی رات۔ اور اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں تھا جس مقدس رات میں یہ انقلابی کتاب دنیا کو دی جا رہی تھی۔ وہ رات یقیناً تمام نسل انسانی کے لیے فیصلہ کن رات تھی۔ اسی رات کو یہ اٹل فیصلہ لکھا جا رہا تھا کہ جو لوگ ہماری طرف بڑھیں گے، ہم انھیں گلے لگا لیں گے، اور جو ہم سے بھاگیں گے، ہم انھیں مٹا دیں گے، لیکن حدیث کی لیلۃ القدر کا تصوّر بالکل جُدا ہے۔ اُور اسلامی دنیا اسی لیلۃ القدر کو ڈھونڈتی رہتی ہے۔
تحروا الیلۃ القدر فی رمضان کے آخری عشرہ میں لیلۃ القدر

العشر الاواخر من رمضان — کی تلاش کرو۔ (موطا ص۹۸)

التمسوھا فی التاسعة والسابعة والخامسة الباقیة من الرمضان — لیلۃ القدر کو اکیسویں تیئسویں اور پچیسویں رات میں ڈھونڈو۔ (موطا ص۹۸)

پہلے زمانے میں زاہد قسم کے مسلمان اِن راتوں میں جاگتے رات بھر عبادت کرتے، اور صبح اُٹھ کر دوسروں کو بتاتے کہ یوں رات کو جلووں کا طوفان اُٹھا تھا۔ اور یوں درخت سجدے میں گر گئے تھے۔ نہ جاگنے والے یہی سمجھتے ہوں گے کہ مولانا سچ کہہ رہے ہیں۔ لیکن ہم صرف اتنا دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ کہ اگر واقعی لیلۃ القدر ہر رمضان میں آتی ہے، تو وہ گذشتہ تین سو برس میں شب بھر جاگنے والے چوکیداروں۔ ریلوے ملازموں۔ ملاحوں۔ ہوابازوں اور مورچے میں ڈٹے ہوئے فوجیوں کو کیوں نظر نہ آئی ؟

قرآن میں ردّ و بدل

قرآن شریف میں مذکور ہے

نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ — ہم نے یہ قرآن شریف نازل کیا اور ہم اس کی ضرور حفاظت کریں گے۔

اور ہمارا ایمان ہے کہ الٰہی پیغام کا ہر لفظ محفوظ ہے۔ لیکن بعض اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ چند آیات پہلے قرآن میں موجود تھیں لیکن بعد میں نکال دی گئیں۔ مثلاً

لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ لکبتتھا الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھا فانا قد قراناھا
(موطا ص ۳۴۵)

اگر لوگ یہ مجھے یہ نہ کہتے کہ عمر بن خطاب نے قرآن میں اضافہ کر دیا ہے تو میں یہ آیت اس میں اضافہ کر دیتا الشیخ والشیخۃ ... کہ جب کوئی بوڑھا اور بڑھیا زنا کے مرتکب ہوں تو انھیں سنگسار کر دو۔ ہم یہ آیت قرآن میں پڑھتے

اگر پڑھتے رہے تو نکالی کس نے؟ اور اگر نکال دی گئی تھی تو اللہ کا وعدہ حفاظت قرآن کیا ہوا؟

اس موضوع پر ایک قول بخاری میں بھی موجود ہے۔

عن عمر بن خطاب قال ان اللہ بعث محمداً صلی اللہ علیہ وسلم وانزل علیہ الکتاب فکان فیما انزل آیۃ الرجم۔

عمرؓ بن خطاب فرماتے ہیں کہ اللہ نے محمدؐ کو رسول بنا کر بھیجا۔ اور اُس پر ایک کتاب نازل کی۔ جس میں آیت رجم بھی موجود تھی۔

یعنی امام بخاری نے بھی یہ تسلیم کر لیا کہ قرآن میں آیت رجم موجود تھی۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ گئی کہاں؟

یہ خرابی محض اس لیے پیدا ہوئی۔ کہ امام بخاری اور دیگر ائمہ حدیث کی نظر ہمیشہ راویوں پر رہی۔ اور یہ نہ دیکھا کہ مضمون روایت کیا تھا اور۔ اس سے کس قدر مفاسد پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ آج اعدائے اسلام

یہی احادیث پیش کر کے ہمیں کہتے ہیں ۔ کہ تمہارے قرآن میں ردو بدل ہوتا رہا ۔ اور اس کی آیات انسانی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکیں کوئی بتاؤ کہ ہم اس الزام کا کیا جواب دیں ۔ ؟

تحریف کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

حضرت علقمہؓ فرماتے ہیں کہ میں شام میں حضرت ابو الدرداؓ سے ملا تو آپ نے پوچھا کہ حضرت عبداللہ سورہ واللیل کی تلاوت کیسے کرتے ہیں ۔ تو میں نے کہا ، اس طرح :

وَاللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ، وَالذَّکَرِ وَالْاُنْثٰی

آپ نے فرمایا :۔ خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلعم سے یہ آیات بالکل اسی طرح سنی ہیں ۔ اور میں اسی طرح پڑھوں گا ۔

(صحیح مسلم ج ۲ ۔ ص ۳۴۹)

تو گویا تین جلیل القدر صحابہ نے شہادت دے دی کہ یہ آیات مذکورہ بالا صورت میں نازل ہوئی تھیں ۔ لیکن آج قرآن شریف میں یوں درج ہیں ۔

وَاللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ۔ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی ۔

اب کس کو صحیح تسلیم کریں ؟ ان صحابہ کو ؟ صحیح مسلم کو ؟ یا قرآن شریف کو ؟ لازماً یہی کہنا پڑے گا ۔ کہ ہمارا قرآن صحیح ہے اور یہ حدیث مشتبہ ۔

اسی قسم کی ایک اور حدیث دیکھیے۔ واقعہ یوں ہے کہ حضورؐ نے اصحاب صفہ میں سے چند حضرات کو اہلِ نجد کے پاس تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا۔ جب وہ بئرِ معونہ (مکہ اور عسفان کے درمیان ایک مقام) میں پہنچے تو عامر بن طفیل۔ رعل۔ ذکوان وغیرہ نے انھیں قتل کر ڈالا۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ان لوگوں کے متعلق مندرجہ ذیل آیت اُتری تھی۔ جو بعد میں منسوخ ہو گئی۔

بَلِّغُوْا قَوْمَنَا اِنَّا قَدْ لَقِیْنَا رَبَّنَا فَرَضِیَ عَنَّا وَ رَضِیْنَا عَنْہُ۔ ہماری قوم کو کہہ دو کہ ہم اللہ سے اس حال میں ملے کہ وہ ہم سے خوش تھا اور ہم اس سے (بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۳ و صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۳۷)

اگر یہ آیت واقعی نازل ہوئی تھی تو مسلمان کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کا باقی رہنا لازمی تھا۔ قرآن شریف میں غزوات اور اس قسم کے دیگر واقعات کے متعلق بیسیوں آیات نازل ہوئیں، جو بعینہٖ محفوظ ہیں۔ اور ان میں سے ایک حرف بھی منسوخ نہیں ہوا۔ اس آیات میں کیا بات تھی کہ پہلے اتری اور پھر منسوخ کر دی گئی۔ کیا ہم تنسیخ کی وجہ یہ سمجھیں کہ شہداء اس تعریف کے قابل نہ تھے۔ یا اس آیت کو قرآن میں باقی رکھنے سے آئندہ نسلوں پہ کوئی بڑا اثر پڑتا تھا؟ چونکہ تنسیخ کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ اور چونکہ اس قسم کی احادیث سے قرآن کی قطعیت پہ چوٹ پڑتی ہے۔ اس لیے ہمارے لیے محفوظ ترین راستہ یہی ہے کہ ہم اس قسم کی تمام احادیث کو ناقابلِ اعتماد قرار دیں

چلتے چلتے اسی نوعیت کی ایک اور حدیث بھی سنتے جائیے۔

عن البراء بن عازب قال نزلت هذه الاية حافظوا على الصلوات والصلوٰة العصر فقرأناها ما شاء الله ثم نسخها الله، نزلت حافظوا على الصلوٰت والصلوٰة الوسطىٰ۔

(صحیح مسلم ج ۲ - ص ۲۰۵)

(براء بن عازب سے روایت ہے کہ پہلے یہ آیت اُتری۔ حافظوا على الصلوات وَالصلوٰة العصر۔ ہم کچھ عرصہ تک اسے پڑھتے رہے، پھر منسوخ ہو گئی۔ اور اِس کی جگہ یہ نازل ہوئی۔ حافظوا.......)

تقریباً تمام مفسرین اور بڑے بڑے صحابہ والصلوٰة الوسطیٰ کے معنی صلوٰة العصر لکھتے آئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ کو "صلوٰة العصر" منسوخ کر کے "صلوٰة الوسطیٰ" نازل کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی تھی۔؟

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ دشمنانِ اسلام ایک خاص سازش کے تحت اِس قسم کی احادیث معتبر راویوں کے نام سے وضع کرتے رہے تاکہ مسلمان کا ایمان قرآن کے متعلق متزلزل ہو جائے اور چونکہ ائمۂ حدیث صرف اسناد کو دیکھتے تھے۔ اس لیے مسلم جیسے محقق بھی اس چال کے شکار ہو گئے۔ اور انھوں نے اس روایت کو اپنے مجموعہ میں شامل

کرلیا۔

یہ حقیقت تسلیم کی جا چکی ہے کہ گوشت میں غذائیت بہت زیادہ ہے۔ اس سے ایک انسان نہ صرف تندرست۔ پھرتیلا اور چاق چوبند رہتا ہے۔ بلکہ گوشت خور، سبزی خوروں کی نسبت زیادہ فراخ حوصلہ کریم الطبع اور بہادر ہوا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کو دیکھ لو کہ ان کی اکثریت گوشت کو حرام سمجھتی ہے۔ اور ان کی حالت یہ ہے کہ ماش کی دال، پھلکے اور پکوڑے کھا کر ان کی توند بڑھ جاتی ہے۔ جسم ڈھیلا پڑھ جاتا ہے۔ فراخ حوصلگی اور شجاعت کی صفات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اور کسی قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ قرآن نے سواری اور گوشت خوری کو اللہ کا ایک انعام قرار دیا تھا۔

وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا تَشْكُرُوْنَ۔

(قرآن)

ہم نے بہائم کو انسان کا مطیع بنا دیا وہ ان پر سوار ہوتا ہے اور انھیں کھاتا بھی ہے ان مویشیوں (کے بالوں ہڈیوں گوبر اور چمڑے وغیرہ) میں انسان کے لیے بے شمار فوائد ہیں۔ کیا انسان ہماری اس نعمت کا شکریہ ادا نہیں کرے گا۔

سرور عالم صلعم اور ان کے صحابہ گوشت کو ایک نعمت سمجھ کر کھایا کرتے تھے۔ لیکن موطا کی ایک حدیث ہمیں گوشت جیسی نعمت سے اجتناب کا حکم دیتی ہے۔

عن عمرؓ ابن الخطاب قال ایّاکم واللحم فان لہٗ ضراوۃ کضراوۃ الخمر۔	عمر فاروق رضؓ فرماتے ہیں کہ گوشت خوری سے بچو۔ اِس لیے کہ شراب کی طرح اسکی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔

اگر ایک اچھی چیز کی عادت بھی پڑ جائے، تو ہرج کیا ہے۔ اور چیز بھی ویسی کہ صحت کے لیے مفید۔ جرات وہمّت جیسے جذبات کی خالق، شرعاً حلال اور اللہ کے ہاں ایک نعمت ایسی چیز سے اجتناب کا مطلب؟ کیا ہم یہ فرض کرنے میں حق بجانب نہیں کہ مسلمانوں کو صحت، ہمّتی اور جذبۂ جاں فروشی سے محروم کرنے کے لیے کسی دشمنِ اسلام نے یہ قول وضع کیا تھا۔ حضرت امام مالک اُس جعلساز کا کھوج نہ لگا سکے۔ اور اسے موطا[1] میں شامل کر لیا۔

---

[1] موطا ۳۰۱

آٹھواں باب

صحیح بخاری پہ ایک نظر

اس میں کلام نہیں ۔کہ امام بخاری (وفات ۲۵۶ھ) نے صحیح احادیث
کی تلاش میں لمبے لمبے سفر کیے۔ ہر حدیث کو پرکھنے کے لیے تمام امکانی
وسائل اختیار فرمائے۔ استخارے کیے۔ کعبہ میں جاکر دعا مانگیں کہ اے اللہ!
مجھے صحیح و غلط میں امتیاز کی توفیق عطا فرما۔ راویوں کا کھوج لگایا۔ ہر قابلِ
ذکر محدث سے مشورہ کیا۔ اور سالہا سال کی مسلسل جستجو کے بعد اپنا
مجموعہ تیار کیا۔ لیکن اس قدر محنت و احتیاط کے باوجود اس مجموعہ میں
چند ایسی احادیث موجود ہیں، جو یا تو تعلیم قرآن سے متصادم ہوتی ہیں۔
یا آپس میں ٹکراتی ہیں۔ یا مسلمانوں کو بیکار۔ اپاہج اور بے عمل بناتی ہیں۔
اور یا اُن سے حضور علیہ السلام اور اُن کی ازواج مطہرات کی توہین کا
پہلو نکلتا ہے۔ ان حالات میں ہمارے لیے دو ہی راستے رہ جاتے
ہیں۔ یا تو ہم صحیح بخاری کے ہر ہر لفظ کی حفاظت کریں۔ اور قرآن و
رسول پہ جو کچھ گذرتی ہے، گزرنے دیں۔ اور یا قرآن کو مقدم رکھتے
ہوئے صرف اُن احادیث کو قابلِ اعتنا سمجھیں جو عیوب بالا سے پاک

ہوں۔ ہم امام بخاریؒ کی محنت، و تلاش کی داد تو دیتے ہیں، اور انھیں بیحد قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ لیکن کریں کیا کہ حضورؐ پرنور کی ذات والا صفات سے ہمیں اس قدر عقیدت و محبت ہے کہ ہم ان کی شان میں کوئی ہلکی سی جسارت بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

امام بخاریؒ کی نظر زیادہ تر اسناد پہ رہی۔ انھیں جس حدیث کے وضعی ہونے پر کوئی تاریخی شہادت نہ مل سکی۔ اسے اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا لیکن صفحات گذشتہ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ احادیث کا کیا حال ہو چکا تھا۔ راویوں کے حالات کس بے احتیاطی سے قلمبند ہوئے تھے۔ اور وہ ایک دوسرے کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے۔ ان حالات میں صرف راویوں پہ اعتماد کر کے بخاری کی ہر روایت کو قولِ رسول سمجھ لینا درست معلوم نہیں ہوتا۔

رسولِ اکرم صلعم بحیثیت نبی تئیس ۲۳ برس زندہ رہے۔ اس لمبی مدت میں یقیناً آپ نے قرآن کے علاوہ بھی کوئی ارشاد فرمایا ہوگا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چودہ لاکھ احادیث کے طومارِ پریشاں میں سے اقوالِ رسول کو کون ڈھونڈے اور کس طرح ڈھونڈے۔ بخاری کی جو احادیث قرآن، عقل اور حقیقت کے خلاف نہیں، ہم اُن کے متعلق یہ حسن ظن تو رکھ سکتے ہیں کہ وہ غالباً اقوالِ رسول ہوں گے۔ لیکن پورے وثوق سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ احادیث کی حیثیت محض تاریخ کی ہے۔ تاریخ میں غلط باتیں بھی ہو سکتی ہیں اور صحیح بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک

مؤرخ تدوینِ تاریخ میں اس قدر خلوص اور محنت سے کام نہیں لے سکتا۔ جتنا امام بخاری نے لیا۔ اس لیے ہمارے لیے صاف اور سیدھا راستہ یہی ہے کہ ہم صرف قرآنِ حکیم پہ ایمان لائیں۔ اور قرآن سے مطابق احادیث پہ حسنِ ظن رکھیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک ظنی چیز کو وحی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا

دع ما یریبک الیٰ مالا یریبک۔ مشتبہ اور ظنی چیز کو چھوڑ کر یقینی اور قطعی چیز کو اختیار کرو۔

کسی تصنیف کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے مضامین پہ ایک ناقدانہ نگاہ ڈالیں۔ اس سلسلے میں بخاری کی چند روایات کو موضوعِ بحث بناتے ہیں۔

ایک پیشگوئی ۶ھ ۔ ۶۲۸ء کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے خسرو پرویز شاہِ ایران (۵۹۰ء ۔ ۶۲۸ء) اور ہرقل قیصر روم (۶۱۰ء ۔ ۶۴۱ء) کی طرف خطوط بھیجے۔ اور انھیں اسلام کی طرف دعوت دی ہرقل نے قاصدِ رسول کی بڑی تعظیم کی۔ لیکن کسریٰ (شاہِ ایران) نے خط پھاڑ ڈالا۔ اور قاصد کو ڈانٹ ڈپٹ کر دربار سے نکال دیا۔ جب حضورؐ کو اس سلوک کی اطلاع ملی، تو آپ نے ایک پیشگوئی کی۔ قیصر کے حسنِ سلوک اور کسریٰ کی بدتمیزی کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضور صرف نسلِ کسریٰ کے خاتمہ کی پیشین گوئی فرماتے۔ اور ہرقل کے لیے اُسی طرح محبت کا اظہار کرتے جس طرح وہ نجاشی سے کیا کرتے تھے لیکن

پیشگوئی بخاری میں موجود ہے۔ وہ ہماری اس تمنا کو پورا نہیں کرتی۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلعم قال اذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہٗ واذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہٗ۔

ابو ہریرہ نبی کریم صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ کسریٰ کے تباہ ہونے کے بعد کوئی اور کسریٰ نہیں ہوگا، اور نہ قیصر کے بعد کوئی اور قیصر۔

(بخاری ج ۲۔ صـ ۱۲۶)

کسریٰ کے متعلق یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ آنحضرت کی رحلت سے صرف دس برس بعد ۶۴۲ء میں جنگ نہاوند نے ساسانی خاندان کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد آخری کسریٰ (یزدگرد) قتل ہوگیا، اور اس کے بعد آج تک پھر کوئی کسریٰ پیدا نہ ہوا۔ چاہئیے تو یہ تھا کہ قیصر کے متعلق بھی یہ پیشگوئی اسی طرح پوری ہوتی لیکن اے کاش کہ ایسا نہ ہوا۔ ہرقل ۶۴۱ء میں فوت ہوا۔ پھر کانسٹینس (۶۴۱ء-۶۴۲ء) اس کے بعد کانسٹینس III (۶۴۲ء - ۶۶۸ء) تخت نشین ہوا۔ پھر قسطنطین چہارم (۶۶۸ء - ۶۸۵ء) پھر قسطنطین (۶۸۵ء - ۶۹۵ء) اور یہ سلسلہ ۱۴۵۳ء تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ سلطان محمد ثانی ۱۴۵۱ء قسطنطین ۱۴۸۱ء فاتح قسطنطنیہ نے اس سلسلہ کو ۱۴۵۳ء میں ختم کیا۔ حضورؐ نے یہ پیشگوئی ۶۳۰ء میں کی تھی۔ اور یہ خاندان اس پیشگوئی کے بعد آٹھ سو تئیس برس تک زندہ رہا۔ اور اس عرصے میں خود مسلمانوں کے بیسیوں فرمانروا سلسلے

ختم ہو چکے تھے۔ مثلاً خلفائے راشدین (۶۳۲ء - ۶۶۱ء) اُمیہ (۶۶۱ء - ۷۵۰ء) عباسیہ (۷۵۰ء - ۱۲۵۸ء) خلفائے اندلس (۷۵۶ - ۱۰۳۱ء) خلفائے فاطمی (۹۰۹ - ۱۱۷۱ء) ایوبیان مصر (۱۱۶۹ - ۱۲۵۲ء) مملیک بحری (۱۲۵۰ - ۱۳۹۰ء) وغیرہ۔ کیا کسی سلسلے کے خاتمہ کی پیشگوئی کا مطلب یہی ہے کہ وہ سوا آٹھ سو برس تک زندہ رہے۔ آٹھ سو برس تو ملوک کی قدرتی عمر ہے۔ اتنی لمبی زندگی کے بعد اگر کوئی سلسلہ منقطع بھی ہو جائے۔ تو کوئی عقلمند یہ باور نہیں کرے گا کہ اس کا خاتمہ کسی پیشگوئی کی وجہ سے ہُوا تھا۔ اگر حضورؐ نے واقعی یہ فرمایا تھا کہ قیصر کے بعد کوئی اور قیصر نہیں ہوگا۔ تو آپ کا اشارہ اس قیصر کی طرف ہوگا، جو اس وقت تخت نشین تھا۔ اگر ہم یہ بھی تسلیم کرلیں۔ کہ ایک پیشگوئی کو پورا ہونے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت چاہیئے۔ تو پھر یہ پیشگوئی زیادہ سے زیادہ سو دو سو سال، یا دو چار پشتوں کے بعد پوری ہو جاتی۔ ایک پیشگوئی سوا آٹھ سو برس تک پوری نہ ہو۔ اور ہم یہی کہے جائیں کہ یہ وحی خفی ہے۔ مخبر صادق کا قول ہے۔ اور خدائی الہام ہے۔ اس طرح کی پیشگوئی تو ہر شخص کر سکتا ہے مثلاً زید کہہ سکتا ہے کہ شاہِ انگلستان کی وفات کے بعد کوئی اور شاہ انگلستان نہیں آئے گا۔ اور اس کے بعد اگر شاہانِ انگلستان کا سلسلہ ایک ہزار برس تک بھی جاری رہے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میری پیشگوئی اتنی ہی صحیح ہے، جتنی قیصر کی موت والی پیشگوئی۔

یہاں یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ قیصران قسطنطنیہ کا سلسلہ

۳۲۰ء سے شروع ہوا تھا۔ پہلا قیصر قسطنطین اول (۲۸۸ء تا ۳۳۷ء) تھا۔ اس کا پایۂ تخت روما تھا۔ ۳۳۰ء میں اس نے قسطنطنیہ کو جس کا قدیم نام "بائزنٹیم" تھا، دارالخلافہ بنا لیا۔ اور اس نسبت سے یہ لوگ "بائزنٹائن امپررز" کہلانے لگے۔ کُل قیصروں کی تعداد چوراسی تھی۔ ہرقل پندرھواں قیصر تھا۔ اور اس کے بعد ۶۹ قیصر اور آئے۔

اس سلسلے میں گیارہ قیصر ایسے بھی تھے، جو قسطنطین کے لقب سے مشہور تھے۔ ہرقل قسطنطین سوم تھا۔ پورا جدول یہ تھا:

(۱) قسطنطین اوّل ۲۸۸ — ۳۳۷ء
(۲) " دوم ۳۱۷ — ۳۴۰ء
(۳) " سوم ۶۱۰ — ۶۴۱ء یہ وہی ہے جس کی طرف حضورؐ نے خط بھیجا تھا۔
(۴) " چہارم ۶۶۸ — ۶۸۵ء
(۵) " پنجم ۷۴۰ — ۷۷۵ء
(۶) " ششم ۷۷۹ — ۷۹۶ء
(۷) " ہفتم ۹۱۲ — ۹۵۸ء
(۸) " ہشتم ۱۰۲۵ — ۱۰۲۸ء
(۹) " نہم ۱۰۴۲ — ۱۰۵۵ء
(۱۰) " دہم ۱۰۵۹ — ۱۰۶۷ء
(۱۱) " یازدہم ۱۴۴۸ — ۱۴۵۳ء

(STROY OF NATIONS BY OMAK)

اگر کوئی غیر مسلم ہم سے پوچھ بیٹھے۔ کہ کیا تمھارے نبی صلعم کی تمام پیشگوئیاں ایسی ہی ہوا کرتی تھیں، تو ہم اس طنز کا کیا جواب دیں گے۔ بغیر اس کے کہ اس حدیث میں قیصر والا حصہ بعد کا اضافہ تسلیم کریں۔

اوّل:-

تاریخی غلط بیانیاں یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ کہ مسجدِ اقصیٰ (یوروشلم) کے بانی حضرت سلیمان علیہ السلام تھے۔ تواریخ ۲ باب ۳ آیات ۱-۲ میں مذکور ہے:

"اور سلیمان خداوند کا گھر یوروشلم میں کوہ موریا پر جو اس کے باپ دادا کو دکھلایا گیا تھا۔ اور اُس جگہ پر جو داؤدؑ نے اُرفان یبوسی کے کھلیان میں مقرر کی تھی، بنانے لگا۔ اور سلیمان نے اپنی سلطنت کے چوتھے برس کے دوسرے مہینے کی دوسری تاریخ کو بنانا شروع کیا"

تواریخ-۲ باب ۶ آیات ۹-۱ میں بیان کیا گیا ہے۔

"خداوند نے میرے باپ داؤدؑ سے کہا تھا۔ کہ اس سبب

لے قدیم الہامی کتابوں میں دو صحیفے تواریخ ۱۔ اور تواریخ ۲ کے نام سے موجود ہیں ملاحظہ ہو بائیبل۔ اس صحیفے میں مسجد اقصےٰ کی تعمیر کی پوری تفصیل کئی صفحات میں بیان کی گئی ہے۔ کہ معمار کہاں سے آئے۔ چوب کہاں سے لی گئی۔ پتھر کہاں سے حاصل کیے گئے اور مسجد کی شکل کیا تھی۔

سے کہ تو نے میرے نام کا گھر بنانے کا ارادہ کیا۔ اچھا کیا
لیکن تو خود یہ گھر نہیں بنائے گا۔ بلکہ تیرا بیٹا جو تیری صلب
سے نکلے گا، وہی تیرا گھر بنائے گا۔"

اور یہ بھی تسلیم کیا جا چکا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تقریباً ہزار سال قبل مسیح تھا۔ ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برطانیکا۔ نیز ارض القرآن ج ۲۔ طبع دوم صہ ۲۴ مصنفہ سید سلیمان ندوی۔ قصص الانبیا میں حضرت ابراہیم کا زمانہ ۲۳۶۱ ق م، اور حضرت داؤد کا ۱۶۹۳ ق م دیا ہوا ہے۔ جو تحقیقات جدیدہ کے رو سے درست نہیں۔ ایک اور کتاب میں (جس کا نام بھول گیا ہوں) حضرت ابراہیم کا زمانہ ۲۰۱۴ ق م دیا ہوا تھا سید البشر (صہ ۶) میں ابوسعید عبدالرحمٰن فریدکوٹی نے کافی تلاش و جستجو کے بعد حضرت ابراہیم کا عہد ۲۰۱۵ ق م بتایا ہے۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس حساب سے حضرت ابراہیمؑ اور سلیمانؑ کے درمیان تقریباً ایک ہزار سال کا عرصہ بنتا ہے۔ تورات میں حضرت سلیمان کا نسب نامہ یوں دیا ہوا ہے:

ابراہیم
اسحاق
یعقوب
یہوداہ
فارص (پہارص)
حصرون (حصران)

آرام (درام)
عمیداب
نحسون
سلمون
بوعز
عوبید

یسی

داؤد

سلیمان (۱۰۱۵ق م – ۹۸۶ ق م)

اِس نسب نامے سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ و سلیمانؑ میں کئی سو برس کا زمانہ حائل تھا۔ حضرت سلیمان نے ۱۰۱۱ ق م میں مسجد اقصیٰ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اگر عام تاریخوں پر اعتماد کرتے ہوئے ہم حضرت ابراہیم کی تاریخ وفات اندازاً ۲۰۰۰ ق م قرار دیں۔ اور مکہ کی تعمیر ۲۰۷۰ ق م کے قریب فرض کر لیں تو تعمیر مکہ اور تعمیر بیت المقدس کے درمیان ۱۰۵۹ برس کا زمانہ بنتا ہے۔ علامہ قسطلانی شارح بخاری لکھتے ہیں۔

..... ان بانی الکعبۃ ابراھیم وبانی بیت المقدس سلیمان وبینھما اکثر من الف سنۃ

حضرت ابراہیمؑ بانی کعبہ تھے اور سلیمانؑ بانی بیت المقدس اور اِن کے درمیان ایک ہزار برس سے بھی کچھ زیادہ کا زمانہ حائل تھا۔

لیکن بخاری کی ایک حدیث کے مطابق یہ زمانہ صرف چالیس سال بنتا ہے۔

عن ابی ذر قال قلت یا رسول اللہ ایّ مسجد وضع فی الارض اوّل قال المسجد الحرام قال قلت ثمّ ایّ قال

ابو ذرؓ کہتے ہیں کہ مَیں نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ زمین پر سب سے پہلے کونسی مسجد بنی۔ فرمایا کعبہ۔ پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسی … ہوئی۔ فرمایا مسجد اقصیٰ

المسجد الاقصیٰ۔ قلت کم کان بینہما قال اربعون سنۃ (صحیح بخاری ج ۲ ص۱۵۵)
میں نے پوچھا کہ ان کی تعمیر میں کتنا زمانہ حائل تھا۔ فرمایا صرف چالیس سال۔

علامہ قسطلانی لکھتے ہیں: "ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم کے فوراً بعد کسی نے مسجد اقصیٰ بنائی ہو، جو گر چکی ہو، اور اسے سلیمان نے دوبارہ تعمیر کیا ہو۔"

"تاریخ کے ٹھوس واقعات کو "ممکن ہے یہ ہو، وہ ہو" سے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اگر حقیقتاً مسجد اقصیٰ ایک مرتبہ پہلے بن چکی تھی، تو تاریخی ثبوت چاہیئے۔

اس اعتراض کے جواب میں مولوی سرفراز خاں خطیب گکھڑ نے اپنی تصنیف "صرف ایک اسلام" کے صفحات ۲۴۔ ۲۸ میں تورات کے ایک حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک معبد بیت ایل کے نام سے بنایا تھا۔ اور انہی بنیادوں پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کی تھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے۔ اس لیے کعبہ اور بیت ایل کی تعمیر میں اندازاً چالیس ہی سال کا زمانہ حائل ہو گا۔

بات نہایت معقول تھی۔ اگر واقعی یہ ثابت ہو جائے، کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیت ایل یہیں تھا، جہاں بیت المقدس تعمیر ہوا تو معاملہ حل ہو جاتا ہے۔ پہلے حوالہ دیکھیے:

"اور یعقوب بیر سبع سے نکل کر حاران کی طرف چلا ..... (راہ میں ایک جگہ خواب میں اللہ کو دیکھا) یعقوب صبح سویرے اُٹھا اور اُس پتھر کو جسے آپ نے سرہانے دھرا تھا۔ لے کر ستون کی طرح کھڑا کیا اور اس کے سرے پہ تیل ڈالا۔ اور اس جگہ کا نام بیت ایل رکھا۔ پہلے اس بستی کا نام لوز تھا"

(پیدائش باب ۲۸۔ آیات ۱۰۔ ۱۹)

انسائیکلو پیڈیا برطانیکا میں بیت ایل ــــــــــ کے متعلق درج ہے۔ کہ اس جگہ کا پہلا نام لوز ــــــــــ تھا جب حضرت یعقوبؑ نے وہاں مذبح بنایا، تو اس جگہ کا نام بیت ایل پڑ گیا۔ یہ مقام یوروشلم سے گیارہ میل دُور شمال میں تھا۔ انسائیکلو پیڈیا نے اس عہد کے کنعان (فلسطین) کا پورا نقشہ بھی دیا ہے۔ چونکہ بیت المقدس یوروشلم میں ہے، اور بیت ایل گیارہ میل دُور تھا۔ اس لیے اُس کی بنیادوں پر مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح حضرت یعقوب نے سالم بستی کے قریب ایک اور مذبح بنایا تھا۔ جس کا نام الا لہ اسرائیل رکھا تھا۔ یہ بستی یوروشلم سے ۴۰ میل شمال میں ہے۔

دوم ۔ سیرت کی تمام کتابیں اس حقیقت پر متفق ہیں کہ حضور علیہ السلام کی عمر تریسٹھ برس تھی۔ حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے:

عن عائشۃ ان النبی صلعم ــــ کہ نبی کریم صلعم نے تریسٹھ سال

توفی وھو ابن ثلاث و ستین۔ — ۶۳ برس کی عمر میں رحلت کی۔

(بخاری ج ۲ ص ۱۷۵)

لیکن حضورؐ کے خادم خاص حضرت انسؓ جو ۱۲۶۸ احادیث کے راوی بھی ہیں۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کی عمر ساٹھ برس تھی۔

انزل علیہ وھو ابن اربعین فلبث بمکۃ عشر سنین ینزل علیہ و بالمدینۃ عشر سنین — چالیس برس کی عمر میں حضور پر قرآن اُترنے لگا۔ اس کے بعد آپ دس سال مکہ میں اور دس سال مدینہ میں زندہ رہے۔

(بخاری ج ۲۔ ص ۱۷۶)

اسی صفحہ پر اسی مضمون کی ایک اور روایت بھی موجود ہے۔ جو حضرت انسؓ ہی سے منقول ہے۔ لیکن حضرت ابن عباس فرماتے ہیں:

بعث رسول اللہ صلعم لاربعین سنۃ فمکث بمکۃ ثلاث عشرۃ سنۃ یوحیٰ الیہ ثم امر بالھجرۃ فھاجر عشر سنین ومات وھو ابن ثلاث و ستین — چالیس برس کی عمر میں حضورؐ پر وحی نازل ہونے لگی۔ اس کے بعد آپ مکہ میں تیرہ برس رہے۔ اور وحی باقاعدہ جاری رہی پھر مدینہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں دس سال رہے۔ اور ترسٹھ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

(بخاری ج ۲ ص ۲۱۴)

بے شمار کتب سیرت کی شہادت اور حضرت ابن عباسؓ و حضرت عائشہؓ کی روایت کی روشنی میں حضرت انس کی روایت غلط ہے۔ حیرت ہے کہ امام

بخاریؒ نے اِس غلط روایت کو اپنی "صحیح" میں کیوں جگہ دی۔ اور زیادہ جرأت اِس امر پر کہ جب حضرت انسؓ کو اپنے آقا۔ رہبر اور پیغمبر کی عمر تک معلوم نہیں تھی، اُن کی بابت ۸۳ روایات کو امام بخاری نے کیسے صحیح سمجھ لیا۔ حضرت اُنسؓ دس برس تک رسول اللہ صلعم کی خدمت میں خادم خاص بن کر رہے، اور انھیں یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کی عمر کتنی تھی؟ اگر معلوم نہیں تھی، تو بتائی کیوں؟ اور اگر معلوم تھی، تو غلط بیانی کیوں کی؟ اور اگر وہ سہواً غلط بیانی کر بیٹھے تھے، تو امام بخاری نے اسے ایک ایسی کتاب میں کیوں شامل کر لیا۔ جو قرآن کے بعد صحیح ترین کتاب سمجھی جاتی ہے؟

سوم:۔ عطا بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے دریافت کیا۔ کہ کیا تورات میں حضور پُر نور کے متعلق کوئی آیت موجود ہے؟ کہا۔ کیوں نہیں؟ آپ کے متعلق یہ آیت تورات میں موجود ہے۔

يَآ ايها النبى انآ ارسلنٰك
شاهداً و مبشراً و نذيراً
وحرزا للاميين انت عبدى
و رسولى سميتك المتوكل
ليس بفظ ولا غليظ الخ

اے رسول! ہم نے تجھے شاہد، بشیر، نذیر
اور اَن پڑھ عربوں کا محافظ بنا کر بھیجا
ہے۔ تو میرا بندہ اور رسول ہے
تو نہ ترش مزاج ہے۔ اور نہ
تند طبع ..... الخ

تورات کو "الف" سے "یا" تک پڑھ جائیے۔ یہ الفاظ کہیں نہیں ملیں گے۔ ممکن ہے، آپ یہ کہہ دیں۔ کہ تورات میں اس قدر تحریف ہو چکی ہے کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی۔ یہ آیت ملے تو کہاں سے؟

اس کے دو جواب ہیں :

اوّل۔ اگر تحریف ہو چکی تھی، تو ابن عمرؓ نے وہ آیت کہاں سے دیکھ لی تھی حضرت موسےؑ[1] کا زمانہ اندازاً پندرہ سو برس قبل از مسیح تسلیم کیا جاتا ہے۔حضور صلعم کے عہد تک پورے دو ہزار سال گذر چکے تھے مبینہ تحریف اس عہد میں ہو چکی ہوگی۔ خود مسیحی مصنفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہود اشکلہ ق م کے زمانہ میں تورات گم ہو گئی تھی۔اور ۵۰ برس کے بعد دستیاب ہوئی تھی مسلم محققین اسی عہد کو تحریف تورات کا عہد تسلیم کرتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ اصلی تورات نہیں ملی تھی۔ بلکہ ایک جعلی نسخہ تیار کر لیا گیا تھا۔بعض کا خیال ہے کہ تورات بخت نصر کے حملے میں ضائع ہوئی تھی۔ یہ حملہ ۶۰۶ ق م میں تاجدار بابل (بخت نصر) نے سلطنت یہود پہ کیا تھا۔ ہر یہودی کو یا قتل کر ڈالا تھا یا قیدی بنا کر ساتھ لے گیا تھا اور تورات کو جلا دیا تھا۔

مبینہ تحریف کا زمانہ ۶۹۸ ق م ہو یا ۶۰۶ ق م۔ وہ بہرحال ولادت حضور صلعم سے صدیوں پہلے ہو چکی تھی اُس زمانے میں تورات کے نسخوں کی تعداد محدود تھی۔ اور تحریف آسانی سے ہو سکتی تھی۔لیکن عہدِ رسولؐ میں ہزار ہا نسخے مختلف ممالک میں موجود تھے۔اور بعد میں اُن کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔اس لیے تحریف آسان نہیں تھی۔ یہ تو ممکن تھا۔

---

[1] احوال کتاب مقدس۔حصہ اول باب ۸۴ صفحہ ۱۱۷ مطبوعہ لندن ۱۸۶۰ء

کہ کوئی شخص اپنے ذاتی نسخے میں ردّ و بدل کر دیتا لیکن دوسروں کو اِس
تحریف کا قائل کرنا آسان نہ تھا۔ آخر یہودیوں میں بھی ایسے ہزار ہا
اشخاص موجود ہوں گے جنھیں اپنی کتاب سے اُسی طرح محبت ہو گی،
جس طرح ہمیں قرآن سے ہے۔ اگر ہم قرآن میں تحریف کا تصوّر تک
برداشت نہیں کر سکتے، تو یہودیوں کے متعلق یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اُن کا
ہر فرد تحریف کے لیے تیار رہتا۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ ۔

موسیٰ کی قوم میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو سچائی کا راستہ دکھاتے تھے۔

یہ سچے یہودی تورات کی تحریف کس طرح گوارا کر سکتے تھے۔ بنابریں
اگر تحریف ہوئی تھی تو وہ یقیناً نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے ہو چکی ہو گی۔
اِن حالات میں کیا ہم یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ ابن عمرؓ نے وہ آیت کہاں
سے دیکھ لی تھی۔

دوم۔ حضرت مسیحؑ نے اعلان کیا تھا۔

"جب تک زمین و آسمان نہ ٹل جائیں، ایک نقطہ یا شوشہ
تورات سے ہرگز نہیں ٹلے گا۔"

(انجیل متی باب ۵ آیت ۱۸)

اگر تورات محرّف ہو چکی تھی، تو حضرت مسیحؑ اتنے زور سے یہ اعلان کیوں
کرتے۔ صاف صاف کہہ دیتے کہ تورات گم ہو چکی ہے، یا بگڑ چکی ہے۔
اس کے تمام احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ اِس لیے میں نئی کتاب لے کر آیا ہوں

تورات کی تصدیق کرنا، اور دنیا کو ڈنکے کی چوٹ کہنا، کہ تورات کا ہر شوشہ اور نقطہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اور جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں، اس کا ایک حرف تک بدل نہیں سکتا۔ صاف صاف اعلان ہے اس حقیقت کا۔ کہ حضرت مسیح کے عہد تک تورات اپنی اصلی حالت میں باقی تھی

تورات کے غیر محرف ہونے پر کچھ تاریخی شواہد بھی موجود ہیں لیکن چونکہ ہمارے علما الہام کے مقابلہ میں تاریخ کو کوئی وقعت نہیں دیتے اس لیے ہم اس موضوع پر قرآن کا فیصلہ درج کرتے ہیں۔

(۱) سورۂ بقر کی ابتدائی آیات میں ہمیں تمام سابقہ آسمانی صحائف پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر وہ کتابیں محرف ہو چکی تھیں اور غلط سلط تھیں تو ان پر ایمان لانے کا مقصد؟

(۲) جس طرح انجیل کے متعلق قرآن نے ہمیں بتایا کہ وہ تورات کی مصدق تھی۔

وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰاةِ	ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی۔ جس میں نور و ہدایت ہے اور جو تورات کی تصدیق کر رہی ہے۔

اسی طرح قرآن نے تورات و انجیل ہر دو کی تصدیق کی ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰاةِ وَالْاِنْجِيْلِ۔	قرآن تورات و انجیل ہر دو کی تصدیق کر رہا ہے۔

تصدیق کے معنی ہیں سچا سمجھنا، اور درست تسلیم کرنا۔ جب قرآن تورات وانجیل کی صداقت کا اعلان کر رہا ہے؛ تو ہم کون ہوتے ہیں انھیں جھوٹا سمجھنے والے۔ کیا قرآن ایک محرّف اور جھوٹے صحیفے کی صداقت کا اعلان کر سکتا تھا۔ کیا خدا کو علم نہیں تھا کہ تورات میں تصرّف ہو چکا ہے۔ اگر علم تھا تو تصدیق کیوں کی؟ کیا کوئی مجسٹریٹ جعلی دستاویز کی دیدہ و دانستہ تصدیق کر سکتا ہے؟

(۳) آپ کہیں گے کہ اللہ نے اصلی تورات کی تصدیق کی تھی، نہ کہ صحیفۂ رائجہ کی۔ بہت اچھا، تو پھر قرآن نے یہ کیوں کہہ دیا؟

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ۔

اے رسول! اہلِ کتاب سے کہہ دو۔ کہ جب تک وہ تورات وانجیل پر عمل نہیں کریں گے اُن کی بگڑی کبھی نہ بن سکے گی۔

اگر یہ کتابیں انسانی دست برد سے ناپاک ہو چکی تھیں تو اہلِ کتاب کو ان پر **عمل کرنے کی دعوت کیوں دی؟** ——— اور سنیئے!

.....وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ....

اور اُن کے پاس تورات موجود ہے۔ جس میں اللہ کا حکم درج ہے۔

یہ نہیں فرمایا۔ کہ **درج تھا۔ بلکہ درج ہے۔** نحو کا مشہور قاعدہ ہے کہ جہاں جار و مجرور کا متعلق مذکور نہ ہو، وہاں موجودٌ یا کائن محذوف فرض کر لیا جاتا ہے۔ اس قاعدے کی رُو سے آیت کے معنے

ہوں گے :

..... تورات میں اللہ کا حکم موجود ہے"۔
لیکن آپ کہتے ہیں کہ موجود تھا یا کس کو صحیح سمجھوں؟ آپ کو یا اللہ کو؟

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ۔
(قرآن)

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت، اور نور موجود ہے۔

ایک اور آیت ملاحظہ ہو :-

وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ ... الخ

اگر یہود و نصاریٰ ان کتابوں پر ایمان لا کر نیک بن جاتے۔ جو اُن پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ تو وہ ہمارے انعامات کے مستحق بن جاتے۔

اس آیت میں اہلِ کتاب کو تورات و انجیل پر ایمان لا کر نیک بننے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اگر یہ کتابیں غلط تھیں، تو اللہ نے ان پر ایمان لانے کا حکم کیوں دیا۔ ممکن ہے، آپ یہ کہیں، کہ جب تورات و انجیل اصلی حالت میں موجود تھیں، تو پھر قرآن اُتارنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں یہاں صرف قرآن کا جواب پیش کروں گا۔

وَهَٰذَا كِتَابٌ مُبَارَكٌ أَنزَلْنَاهُ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

ہم نے تمہیں یہ مبارک کتاب (قرآن) عطا کی ہے اسے مانو اور گناہوں سے بچو۔ تاکہ تم

اَنۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اُنۡزِلَ الۡكِتٰبُ عَلٰی طَآئِفَتَيۡنِ مِنۡ قَبۡلِنَا وَاِنۡ كُنَّا عَنۡ دِرَاسَتِهِمۡ لَغٰفِلِيۡنَ ۔

ہماری رحمت کے مستحق بن سکو۔ اب تم یہ عذر پیش نہیں کر سکتے کہ ہم سے پہلے دو اُمتوں (یہود و نصاریٰ) پر کتابیں نازل ہوئی تھیں لیکن وہ اجنبی زبان میں تھیں اور ہم انھیں سمجھ نہیں سکتے تھے

یعنی نزول قرآن کی وجہ یہ نہیں بتائی گئی۔ کہ پہلی کتابیں مسخ ہو چکی تھیں بلکہ یہ کہ وہ ایسی زبان میں تھیں جس سے عرب نا آشنا تھے۔ کیا تورات کی صحت پر اس سے بڑی شہادت پیش کی جا سکتی ہے؟

اور سُنیئے!

لَيۡسُوۡا سَوَآءً ؕ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتۡلُوۡنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيۡلِ وَهُمۡ يَسۡجُدُوۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُسَارِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۔

سارے اہلِ کتاب بُرے نہیں۔ ان میں ایسے نیک اور پرہیزگار بھی موجود ہیں جو رات کو اللہ کی آیات (تورات و انجیل) پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں۔ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں نیکی کی ترغیب دیتے۔ بُرائی سے روکتے، اور نیک اعمال کی طرف بے تابانہ بڑھتے ہیں۔ یہ لوگ صالح ہیں۔

اس آیت میں تورات و انجیل کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے۔ اگر تورات

بگڑ چکی ہوتی، تو اللہ اس کے احکام کو آیات کیوں کہتا۔ اور اس پر عمل کرنے والوں کو صالحین میں کیوں شمار کرتا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ صورت حالات ہے تو پھر مسلمان بننے کی ضرورت کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ عیسائی رہ کر نیک عمل کیے جاؤ، نہ قرآن پر ایمان لانے کی ضرورت، اور نہ رسول ؐ پر۔ سارے اسلام سے چھٹی مل گئی۔ یہ سوال اسلام کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اسلام کسی زبانی اقرار کا نام نہیں۔ بلکہ نیکی کا نام ہے۔ اگر ایک عیسائی نیکی کر رہا ہے تو وہ قرآن کی رُو سے مسلمان ہے۔ رسول و قرآن کا صحیح پیرو وہی ہے جو نیک ہو نہ وہ جو کلمہ پڑھ کر سارے جہان کی بدمعاشیاں کرتا پھرے آپ کے ہاں اسلام چند عقائد کا نام ہے۔ اور قرآن کے نزدیک صرف نیکی اس لیے خدا و رسول کا صحیح پیرو وہ ہے جو ان احکام پہ عمل کر رہا ہے خواہ اس پر عیسائیت کا لیبل لگا ہوا ہو، یا یہودیت کا نہ وہ جو خدا و رسول کا صرف زبانی قائل ہو اور عملاً کافر چونکہ قرآن کی رُو سے:

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ

یہ قرآن ابراہیم ؑ اور موسیٰ ؑ کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔

اس لیے کتاب موسیٰ کا سچا عامل خود بخود قرآن کا عامل بن جاتا ہے مت بھولیے کہ ہر عمل کا ایک صلہ ہے۔ جو کسی طرح ضائع نہیں ہوتا۔ عامل خ

مرد ہو یا عورت، عیسائی ہو یا مسلمان۔ یہ صلہ اُسے مل کر رہے گا
اہل کتاب کے متعلق ارشاد ہے:

وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ ۔
ہم ان اہل کتاب کے کسی نیک عمل کو ضائع نہیں جانے دیتے۔

ممکن ہے آپ سوچ رہے ہوں، کہ وہ جو قرآن میں یہود کے متعلق لکھا ہے؟ کہ وہ تورات میں تحریف کیا کرتے تھے۔ اُس کا کیا مطلب ہے؟ مطلب میں سمجھائے دیتا ہوں۔ تحریف کے دو معنی ہیں۔ الفاظ کو بدلنا یا من مانی تفسیر کرنا۔ چونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ تورات اصلی حالت میں موجود تھی۔ اس لیے تحریف کا دوسرا مفہوم لیا جائے گا۔ یہود کا دوسرا جرم یہ بیان ہوا ہے۔ کہ وہ کتاب لکھ کر اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ کتاب کے معنی ہیں تحریر۔ مطلب یہ کہ وہ اپنی اغراض کو پورا کرنے کے لیے کوئی تحریر لکھ کر کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ بھی الہامی ہے جس طرح کہ مسلمانوں نے لاکھوں احادیث گھڑ کر اپنی اغراض پوری کیں۔ اِس آیت کا مطلب یہ نہیں۔ کہ وہ اِس طرح کی تحریرات کو جزوِ تورات بنا دیا کرتے تھے۔

ان تفاصیل کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ عہدِ رسول صلعم میں تورات اصلی حالت میں موجود تھی۔ اور وہی تورات ہم تک پہنچی ہے اِس تورات میں ابن عمرؓ کی ذکر کردہ آیت کہیں موجود نہیں۔ اِس لیے یہ حدیث ایک تاریخی غلط بیانی ہے۔ اور جعلی ہے۔

چہارم۔ قرآن اور تاریخ ہر دو شاہد ہیں۔ کہ رسول اللہ صلعم نہ لکھ سکتے تھے۔ اور نہ لکھی ہوئی چیز پڑھ سکتے تھے۔ لیکن بخاری میں ہے کہ وہ لکھ سکتے تھے۔ حدیث یوں چلتی ہے کہ جب حضورؐ ذی قعدہ میں عمرہ کے لیے مکہ تشریف لے گئے، تو اہلِ مکہ نے کچھ پابندیاں عائد کر دیں اور اس سلسلہ میں ایک تحریری معاہدہ ہوا۔ جس کا ایک جملہ یہ تھا: "یہ وہ معاہدہ ہے، جسے محمد رسول اللہ تسلیم کرتے ہیں"۔ کفارِ مکہ نے "رسول اللہ" کے لفظ پر اعتراض کیا۔ اور کہا کہ ہم آپ کو رسول ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے محمد بن عبداللہ کی حیثیت سے معاہدہ کریں۔ آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ "رسول اللہ" کے الفاظ مٹا دو۔

قال لا واللہ لا امحوك ابدا۔ فاخذ رسول اللہ صلعم الکتاب فکتب ھذا ما قاضیٰ محمد بن عبد اللہ ... ... الخ

علیؓ نے جواب دیا۔ خدا کی قسم میں آپ کے نام سے رسول کا لفظ کبھی جدا نہیں کروں گا۔ اس پر رسول اللہ صلعم نے وہ کاغذ اٹھا لیا۔ اور اس پر لکھ دیا "یہ وہ فیصلہ ہے جسے محمد بن عبد اللہ تسلیم کرتے ہیں ...... الخ

(بخاری ج ۲۔ ص۶۱)

بخاری کی ایک اور روایت (ج ۲ ص۱۳۵) بتلاتی ہے۔ کہ حضور نے "رسول اللہ" کا لفظ کھرچ ڈالا تھا۔ اور کاتب نے "ابن عبداللہ" کے لفظ کا اضافہ کر دیا تھا۔ اسی حدیث پر باقی محدثین اعتماد

کرتے ہیں۔ اور تاریخ بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ اس لیے "لکھنے" والی حدیث صحیح نہیں

بعض شارحین بخاری نے فَکَتَمَہٗ کے معنی فَاَمَرَ بِکِتَابَتِہٖ کیے ہیں اور یہ وہ معنی ہیں، جو کسی لغات میں نہیں ملتے:-

---

نواں باب

حضورؐ کی تصویر حدیث میں

قرآن میں حضورؐ کے متعلق ارشاد ہے:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ — اے رسول! تمھارا کردار عظیم الشان ہے۔

کیوں عظیم الشان نہ ہو۔ ہمارا رسول قائم اللیل، صائم الدہر شب کو زاہد۔ دن کو غازی تمام عمر کفر کے خلاف معرکہ آرا رہا۔ اِس پر قرآن اُترا۔ اُس نے اللہ کا نام بلند کیا۔ یتیموں کو سنبھالا۔ بیواؤں کو نوازا غریبوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ گرے ہوؤں کو اُٹھایا۔ گڈریوں کو قیصر و کسریٰ کے تخت پہ بٹھایا۔ شرابیوں کو پاکباز بیکاروں کو کارساز۔ لٹیروں کو پاسبان اور جاہلوں کو نکتہ دان بنا دیا۔ وہ ظلم سہتا اور اُف نہ کرتا۔ گالیاں سُنتا اور تُف نہ کہتا۔ نہ دولت کی دُھن، نہ منصب کی خواہش، نہ قیادت کا شوق، نہ آرائش کا ذوق۔ جو مل گیا کھا لیا، جو میسر ہُوا پہن لیا، جہاں جگہ ملی لیٹ گئے۔ گھر کا اثاثہ صرف ایک چارپائی۔ ایک چکی، اور ایک سرہانہ جس

ہیں کھجوروں کی چھال بھری ہوئی تھی۔ لباس کھدر کا صرف ایک جوڑا بکریوں کا دودھ خود دوہتے۔ جوتوں کی مرمت خود کرتے۔ ہر مریض کی عیادت کو جاتے۔ ہر جنازے میں شامل ہوتے۔ اندھوں کو راہ پر ڈالتے۔ مزدوروں کا بوجھ اُٹھواتے۔ دُکھیوں کا سہارا بنتے۔ ناواقف کو پہلے سلام کہتے۔ خوشامد سے نفرت کرتے۔ نمائش کو بُرا جانتے مجسم نیکی۔ مجسم رحمت فخرِ مسلماں۔ نازشِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم۔ درست کہا تھا حضورؐ نے۔

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مکارم الاخلاق۔ — مجھے بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا۔

(موطا ص۳۵۱)

حضورؐ کے یہی وہ بلند و پاکیزہ اوصاف تھے۔ جنھوں نے مغرور و خود پسند عربوں کو آپ کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان اوصاف کے مالک نہ ہوتے۔ اُن میں ذرہ بھر لالچ۔ تھوڑی سی خود پرستی، اور ان کے عظیم الشان اعمال میں خود غرضی کی ذرا بھی آمیزش ہوتی، تو آپ کو قطعاً یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ آپ کی خاطر نہ دنیا سر کٹاتی۔ اور نہ زندگی بھر کا اثاثہ آپ کے قدموں پہ لا ڈالتی۔ بلند کردار ایک زبردست قوت ہے۔ اور اسی کے بل پر حضورؐ نے نہ صرف لاکھوں دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ بلکہ ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ جو اقلِ قلیل مدت میں عثمان

سے پیرس تک وسیع ہو گئی تھی۔ سچ ہے۔

فقر چوں عریاں شود زیر سپہر | از نہیب او بلرزد ماہ و مہر
فقر عریاں گرمی بدر و حنین! | فقر عریاں بانگ تکبیر حسینؓ
بے پراں را ذوقِ پروازے دہد | پشہ را تمکین شہبازے دہد

برگ و ساز او ز قرآنِ عظیم
مردِ درویشے نہ گنجد در گلیم!

(اقبالؒ)

اس میں کلام نہیں کہ حضورؐ کے ان اوصاف جمیلہ کا شہرہ صرف احادیث کی بدولت ہوا۔ اور ہم حدیث کے اس گراں بہا ذخیرے پہ ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ لیکن بعض ایسی احادیث بھی ہیں جو کائنات کے اس محسن اعظم کا کردار معیوب شکل میں پیش کرتی ہیں۔ اتنا معیوب کہ ہم شرم سے کسی کو بتا بھی نہ سکیں۔ درست کہا تھا مولانا عبید اللہ سندھی نے کہ میں کسی نومسلم یورپین کو صحیح بخاری نہیں پڑھا سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں مجلس عام میں نہیں بتا سکتا۔

(الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر صفحہ ۲۸۵)

وہ وجہ کیا تھی؟ آئیے آج ہم اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں روزے کی نہایت عمدہ تشریح درج ہے

الصیام جنۃ فلا یرفث | روزہ گناہ کے خلاف ایک ڈھال ہے
ولا یجھل وان امرأ قاتلہ | روزہ دار کو چاہیئے کہ وہ نہ تو منہ سے

او شاتمہ فلیقل انی صائم مرتین والذی نفسی بیدہٖ لخلوف فم الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسک فانہٗ یترک طعامہٗ وشرابہٗ وشہواتہٗ من اجلی۔

(بخاری کتاب الصوم)

کوئی بُری بات نکالے اور نہ کسی سے اُلجھے۔ اگر کوئی شخص اُسے گالیاں دے یا لڑ پڑے تو اُسے دو مرتبہ کہے کہ میں روزہ دار ہوں (اسلیے تمھیں جواب نہیں دے سکتا) خدا کی قسم اللہ کو روزے دار کے مُنہ کی خوشبو مشک سے زیادہ پسند ہے اس لیے کہ وہ کھانا پینا اور شہوات اللہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

ایک اور حدیث دیکھیے:

من لم یدع قول الزور والعمل بہٖ لیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہٗ وشرابہٗ

(بخاری کتاب الصوم)

جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ اور فریب کاری سے باز نہیں رہ سکتا اُسے کہہ دو کہ اللہ کو اس کی بھوک اور پیاس کی قطعاً ضرورت نہیں۔

ان احادیث سے روزہ کا فلسفہ واضح ہوگیا۔ یعنی پورے تیس دن تک ہر قسم کی بدزبانی، بدکاری اور شہوات سے دور رہ کر اپنے اخلاق اور روحانیت کو بلند کرنا اور اپنے آپ کو جفاکش بنانا۔ اس لیے کہ مسلمان کو ہر آب وہوا اور ہر قسم کے حالات میں کفر کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ اگر ایام امن میں اسے جفاکش نہ بنایا گیا تو وہ جنگ کی سختیاں نہیں جھیل سکے گا۔

آئیے ذرا دیکھیں کہ حضور پر نور صلعم کے متعلق بخاری میں کیا لکھا ہے؟

عن عائشۃ قالت کان النبی صلعم یقبل و یباشر وھو صائم۔ بخاری ص۲۲۶	حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور صلعم روزہ رکھ کر اپنی ازواج کے بوسے لیتے اور اُن سے مباشرت فرمایا کرتے تھے۔

مباشرت کے معنی ہیں مجامعت اور بوس و کنار وغیرہ۔ لیکن اس حدیث میں مباشرت سے مراد کیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی سنیئے۔ آپ صحیح مسلم کی اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فتح الملہم (ج ا ص۴۵۶) میں فرماتے ہیں۔

المباشرۃ فوق السرۃ و تحت الرکبۃ بالذکر والقبلۃ اوالمعانقۃ اوالمس وغیر ذالک حلال باتفاق المسلمین	روزہ رکھ کر عورت کے ساتھ ناف سے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے مباشرت کرنا۔ یعنی اسے چھونا، چومنا، گلے لگانا اور آلۂ تناسل کا استعمال کرنا مسلمانوں کے ہاں باتفاقِ آرا حلال اور جائز ہے۔

یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے۔

اوّل۔ روزے کا مقصد شہوات کو ترک کرنا ہے۔ نہ کہ بوس و کنار اور گھٹنوں سے نیچے آلۂ تناسل کا استعمال۔

دوم۔ یہ حدیث اوپر والی دو حدیثوں سے متصادم ہوتی ہے۔

سوم گناہ اور محرکاتِ گناہ ہر دو سے بچنا ضروری ہے۔ ایک بدمعاش کی مجلس اسی لیے بُری ہے۔ کہ وہ محرّک گناہ ہے۔ کسی رنڈی کے ہاں گانا سننا اسی لیے معیوب ہے کہ وہ محرّکِ زنا ہے کیا رمضان میں بوس و کنار جماع کا شدید محرک نہیں۔ اپنے آپ کو دیکھیے۔ کسی سے پوچھیے اور انصافاً کہیئے کہ کتنے شوہر بیوی کو چومنے چاٹنے اور گلے لگانے کے بعد جماع سے بچ سکے ہیں؟ روزے میں بوس و کنار کی ترغیب دینا۔ اور پھر اس کے نتائج پر قابلِ عقوبت ٹھہرانا تقاضائے انصاف نہیں

یہی وہ حدیث ہے جس نے مجھے احادیث سے بدظن کیا۔ اور اس کتاب کی محرک بنی۔ مَیں نے اس حدیث پر ہر قسم کے آدمیوں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ مثلاً علماء۔ ملّا۔ پروفیسر۔ معلم۔ انگریزی تعلیم یافتہ اور عوام۔ صحیح المذاق علماء نے کہا۔ ادب کا تقاضا یہی ہے کہ خاموش رہیئے۔ پروفیسر، معلّم اور انگریزی تعلیم یافتہ کانوں پہ ہاتھ دھرنے لگے۔ اور عوام غضب سے کھولنے لگے۔ کہ سرورِ کائنات کی ذات پر یہ حملہ؟ لیکن مُلّا ہر مقام پر یہی کہتا نظر آیا۔ کہ حدیث درست ہے اور حضورؐ یہ کام کیا کرتے تھے۔ اگر مجھ پر اعتبار نہ ہو، تو خود یہ حدیث سنا کر دیکھ لیجیے۔

سوال۔ ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ حضورؐ کو اپنے آپ پر زبردست ضبط حاصل تھا۔ ان کی مباشرتِ محرّکِ جماع نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے اُن کا یہ عمل قابلِ اعتراض نہیں۔

جواب۔ رسول اللہ صلعم کا ہر عمل اُمت کے لیے واجب التقلید ہے۔ مانا کہ رسول اللہ صلعم ضبط کی نعمت سے بہرہ ور تھے۔ لیکن اُمت میں کتنے ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو معانقہ وغیرہ کے بعد جماع سے رُک سکیں گے۔ یہی وجہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضؓ اس حرکت سے روکا کرتے تھے۔

عن نافع ان عبداللہ بن عمرو کان ینھی عن القبلۃ

نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضؓ روزے کی حالت میں مباشرت اور بوس و کنار سے روکا کرتے تھے۔

(موطا صـ۸۹)

حضرت عروہ رضؓ بن زبیر کا قول ہے:

لم ار ی القبلۃ للصائم تدعوا الی الخیر

میری رائے یہ ہے کہ روزے میں بوسہ بازی کبھی اچھا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

(موطا صـ۸۹)

امام مالک رحؒ کے تمام پیرو اسے حرام سمجھتے ہیں۔ ابن المنذر نے اس کی حرمت پر کئی علماء کی آراء جمع کی ہیں۔ امام محمد اسے مکروہ مطلق سمجھتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضؓ بھی روزے میں مباشرت سے روکا کرتی تھیں۔

لے ملاحظہ ہو فتح الملہم ج ۳ صـ۱۲۶

قال الاسود قلت لعائشۃ ایباشر الصائم قالت لا۔

اسود کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ روزے دار کو مباشرت کی اجازت ہے؟ فرمایا ہرگز نہیں

(نسائی باب الصیام)

حذیفہ تو اس معاملے میں یہاں تک محتاط ہیں کہ روزے میں بیوی کا تصور تک بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ فرماتے ہیں:

من تامّل امرأته وهو صائم بطل صومه

روزہ رکھ کر جو شخص بیوی کا تصوّر بھی باندھے، اُس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

(فتح الملہم ص ۱۲۶)

دیکھا آپ نے ہمارے صحیح الفکر علما اس مباشرت کے کس قدر مخالف تھے۔ لیکن دوسری طرف ہمارے بعض محدّثین اس لذیذ فعل کے اس قدر شائق تھے کہ ایک سے ایک بڑھیا حدیث لکھتے چلے گئے۔ امام بخاری اور مسلم نے تو صرف بوس و کنار اور گھٹنوں سے نیچے استعمال آلت کی اجازت دی تھی۔ ابو داؤد ایک قدم اور آگے نکل گئے۔ کہتے ہیں۔

عن عائشۃ ان النبی کان یقبلها ویمص لسانها وهو صائم۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ روزہ رکھ کر مجھے چومتے اور میری زبان چوستے تھے۔

کیا ابو داؤد کو فقہ کا یہ معمولی سا مسئلہ معلوم نہیں تھا کہ کھانے

پینے سے روزہ باطل ہو جاتا ہے ؟ کیا زبان چُوسنے سے دوسرے کا تھوک اپنے تھوک میں مل کر پیٹ میں نہیں چلا جاتا ؟ اور کیا اس صورت میں روزہ باطل نہیں ہو جاتا ؟

ایک اور سُنیئے :

..... ان عائشۃ بنت طلحۃ کانت عند عائشۃ رضی اللہ عنہا فدخل علیہا زوجھا وھو عبد اللہ بن عبد الرحمٰن بن ابی بکر الصدیق وھو صائم فقالت لہ عائشۃ ما یمنعک ان تدنو من اھلک فتقبلھا وتلاعبھا فقال اُقبلھا وانا صائم قالت نعم

.... عائشہ بنت طلحہ حضرت عائشہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں کہ اوپر سے اس کا شوہر عبد اللہ حضرت ابوبکر کا پوتا آگیا۔ اس نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ حضرت عائشہ رض فرمانے لگیں، تمہیں اپنی بیوی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے اور اسے چُومنے سے کیا چیز روک رہی ہے۔ پوچھا کیا میں روزے کی حالت میں ایسا کر سکتا ہوں ؟ کہا - ہاں -

(موطا - مالک صـ۸۹)

ایک طرف تو حضرت عائشہ رض اسود کو روک رہی تھیں - اور دوسری طرف عبد اللہ کو کسی استفسار کے بغیر بوس و کنار کی ترغیب دے رہی ہیں -

میری ناقص رائے میں یہ دونوں احادیث نا قابلِ اعتماد ہیں -

اوّل - اس لیے کہ ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں - اذا تعارضا

تناقض تھا۔ جب دو قول ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں، تو دونوں درجہ بہ درجہ اعتبار سے ساقط ہو جاتے ہیں۔

دوم۔ اس لیے کہ حیا عورت کی فطرت ہے ہم یہ کیسے تسلیم کرلیں کہ حضرت عائشہؓ غیر مردوں کو اپنے گھر میں اور وہ بھی روزہ کی حالت میں بوس و کنار کی ترغیب دیتی تھیں۔ کیا اس کام کے لیے رات کافی نہ تھی۔ کیا روزے میں بوس و کنار اتنا ضروری فعل تھا کہ اگر رہ جاتا تو ساری امّت پہ تباہی آجاتی۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ احکام اسلام کی تبلیغ ازواج مطہرات کا بھی کام تھا۔ لیکن یہ مباشرت کہاں کا حکم تھا؟ اور ساری قوم میں حضرت عائشہؓ کو کیا پڑی تھی کہ مباشرت کی تلقین کرتی پھریں۔ آخر حضور علیہ السلام کے حرم میں دس اور ازواج بھی تھیں ہر صحابی کے گھر میں ایک ایک بیوی تھی۔ خود صحابہ کے منہ میں بھی زبان تھی۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ مباشرت کی اکثر احادیث حضرت عائشہؓ سے منقول ہوئیں۔ مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ دشمنانِ اسلام نے حضرت عائشہؓ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقار کو کم کرنے کے لیے یہ احادیث وضع کیں۔ اور ہمارے محدثین نے انھیں صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا۔

مباشرت در حیض

قرآن شریف میں مذکور ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ — لوگ آپ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں۔

قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۔ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۔ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۔

کہہ دیجیے کہ حیض ایک قسم کی غلاظت ہے، اس لیے دوران حیض میں بیویوں سے دُور رہیے۔ اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن کے قریب مت جائیے اور پاک ہونے کے بعد اُن سے مباشرت کیجیے ...

اس آیت میں دو حکم دیئے گئے ہیں۔ اوّل حیض کی حالت میں عورتوں سے دُور رہئیے۔ دوم ان کے قریب تک مت جائیے۔ ذرا دیکھیں، کہ حدیث نے اس" قریب و دُور" کی کیا تشریح کی ہے:

عن عائشۃ .... کان یامرنی فاتزر فیباشرنی وانا حائضٌ

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حیض کی حالت میں رسول اللہ صلعم مجھے تہ پوش پہننے کا حکم دیتے۔ اور اس کے بعد مجھ سے مباشرت کرتے۔

(بخاری کتاب الحیض ج ۱ صفحہ ۴۴)

اس سے اگلی حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

" عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب حضورؐ حیض کی حالت میں مباشرت کا ارادہ فرماتے، تو پہلے ایک تہ پوش پہنا دیتے اور پھر مباشرت کرتے"۔

یہ ہے " قریب و دُور" کی تشریح حدیث میں ۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ

یہاں مباشرت سے مراد صرف بوس وکنار وغیرہ ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کہ حضور صلعم ضبطِ نفس کی نعمت سے بدرجۂ کمال بہرہ ور تھے۔ لیکن یہ باتیں حضور صلعم کی شان سے بہت بعید معلوم ہوتی ہیں۔

علاوہ ازیں محرکاتِ گناہ سے بچنا بھی اتنا ہی ضروری ہے، جتنا گناہ سے۔ اور اسی لیے قرآن نے بار بار کہا ہے۔"حدود الٰہی کے قریب مت جاؤ"۔"فواحش کے قریب مت جاؤ"۔ مشہور حدیث ہے:

من حام حول الحمیٰ وقع فیہ۔	چراگاہ کے ارد گرد گھومنے والا جانور عموماً چراگاہ میں گھس جاتا ہے۔

یعنی جو شخص ممنوعات کے قریب قریب رہتا ہے۔ وہ ان کا ارتکاب بھی کرسکتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے گناہوں کے قریب جانے تک سے روک دیا۔

ایک اور حدیث ہے۔

الحلال بینٌ والحرام بینٌ وبینہما مشتبہات لایعلمہا کثیر من الناس فمن اتقیٰ المشتبہات استبراء لدینہ وعرضہ	حلال وحرام کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ایسے پریشان کن مقامات آ جاتے ہیں جن کی حقیقت سے عوام ناآشنا ہوتے ہیں۔ تو جو شخص ایسے مقامات سے بچے وہ اپنے دین اور عزت کو بچا لیتا ہے۔
(بخاری ج ۱۔ صـ۱۳)	

گو حضور صلعم اس معاملہ میں سخت محتاط واقع ہوئے تھے

واللہ انی لا تقاکم للہ — خدا کی قسم۔ میں تم سب سے زیادہ
واعلمکم بحدودہ — اللہ سے ڈرتا اور اس کی حدود کو پہچانتا
ہوں۔ (موطا صفحہ ۱۱۸)

لیکن اس حدیث پر عمل کرنے والا ایک عام آدمی گناہِ مجامعت کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

ہمارے علماء کہتے ہیں کہ یہ حدیث دراصل یہود کی تردید تھی۔ جو دورانِ حیض میں عورت کو نجس سمجھ کر اس سے چھو جانا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ مان لیا۔ اس تردید کے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا۔ کہ عورت حیض میں ناپاک نہیں ہوتی۔ آپ اس کا پکایا ہوا کھا سکتے ہیں۔ اس کے ہاتھ سے پانی لے کر پی سکتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو چھو سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا مباشرت کیے بغیر یہودی عقیدہ کی تردید نہیں ہو سکتی تھی۔

امام مالکؒ نے بھی یہ احادیث نقل کی ہیں۔ لیکن حضورؐ کی طرف مباشرت منسوب نہیں کی۔ صرف بوسے کا ذکر کیا ہے۔ بدیگر الفاظ امام مالکؒ بھی یہ سمجھتے تھے کہ مباشرت (جس کا مفہوم وسیع تر ہے) کی نسبت حضورؐ والا صفات کی طرف مرادف تنقیص ہے۔

اور سنیئے۔

"ابو سلمہ کہتے ہیں، کہ میں اور حضرت عائشہؓ کا بھائی حضرت عائشہؓ کے پاس گئے۔ اُن کے بھائی نے اُن سے دریافت کیا

کہ رسول اللہ صلعم کس طرح غسل فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے پانی سے بھرا ہوا ایک برتن منگوایا جس سے آپ نے غسل کیا، اور سر پہ بھی پانی ڈالا۔ درمیان میں ایک پردہ تھا۔"

(بخاری جلد اصفحہ ۳۹)

سوال یہ ہے کہ آیا یہ دونوں اِس پردے میں سے حضرت عائشہؓ کو غسل کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو غسل رسول کی نمائش کرنے کا مقصد کیا تھا؟ اور اگر اثبات میں ہے تو پھر۔ ع

وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

کیا کوئی مسلمان یہ برداشت کر سکتا ہے۔ کہ اس کی بیوی ایک پردہ تان کر سارے محلہ کو "شرعی غسل" کا طریقہ بتائے؟ کیا رسول اکرم صلعم کی اپنی آنکھیں اس منظر کو برداشت کر سکتی نہیں؟ اور کیا یہ اتنا مشکل مسئلہ تھا۔ کہ عملی نمونہ پیش کیے بغیر سمجھایا نہیں جا سکتا تھا؟ ذرا اس حدیث کے الفاظ سنیئے:

مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ انزال سے پہلے غسل ضروری ہے یا نہیں۔

عن ابی ھریرۃ ان النبی صلعم قال اذا جلس بین شعبھا الاربع ثم جھدھا فقد وجب علیہ الغسل وان لم ینزل۔	ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ جب کوئی مرد عورت کی ٹانگوں کے درمیان بیٹھ کر زور لگانا شروع کر دے تو اس کے لیے نہانا ضروری ہو جاتا ہے خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔

اِس بحث کو جانے دیجیئے۔ کہ کئی احادیث کی رُو سے غسل ضروری نہیں۔ (تفصیل گذر چکی ہے) حدیث کی زبان دیکھیے کہ ماشاءاللہ کتنی پاکیزہ اور "شستہ" ہے۔

ان اقوال کو اُن افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کرنے کی جرأت اس خاکسار میں تو نہیں کوئی اور کرتا ہے تو کرتا پھرے وَعَلیہا مَا اکتَسَبَتْ وہ اپنے اعمال کا خود جواب دے گا۔

حضرت صفیہؓ کا نکاح

حضرت صفیہؓ جنگِ خیبر کے اسیروں میں شامل تھیں۔ ایک صحابی نے رسول اللہ صلعم سے ایک لونڈی کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا۔ کہ خود چن لو۔ اُس نے حضرت صفیہؓ کو منتخب کیا۔ بعد میں کسی نے کہا۔ کہ یہ ایک رئیس کی بیٹی ہے۔ اسے لونڈی بنا کر اس سے خدمت لینا ظلم ہے۔ اس لیے حضورؐ اسے حرم نبوی میں داخل کر لیں۔ حضورؐ نے یہ تجویز مان لی۔ اور اسے آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ بات سیدھی سادی تھی۔ اور تمام احادیث میں یہ واقعہ اسی طرح بیان ہوا ہے۔ لیکن بخاری کی ایک روایت میں اس واقعہ کو یوں مسخ کیا گیا ہے کہ یہ تمام داستان ہو بہو بن کر رہ گئی ہے حضرت انس کہتے ہیں،

.....ثم قدمنا خیبر فلما فتح اللہ علیہ الحصن ذکر لہ جمال صفیۃ بنت حیّ	.......کہ پھر ہم خیبر میں آئے جب اللہ کے فضل و کرم سے حضورؐ نے قلعہ خیبر کو فتح کر لیا۔ تو کسی نے صفیہ بنت حیّ کے

بن اخطب وقد قتل زوجها وكانت عروسًا فاصطفاها رسول الله لنفسه .... الخ
(بخاری ج ۲ ۔ صفحہ ۱)

جمال کا ذکر کیا۔ نیز کہا کہ اُس کا خاوند جنگ میں مر چکا ہے۔ اور وہ ابھی دُلہن ہے یہ سُن کر رسول اللہ صلعم نے اُسے اپنے لیے پسند کر لیا۔

یعنی رسول اللہ صلعم نے کسی اور خیال سے نہیں۔ بلکہ صفیہ کے حسُن کی وجہ سے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔

سیرت رسولؐ کا ایک اور منظر

احادیث اور کتب سیرت میں مذکور ہے۔ کہ حضورؐ کی کل گیارہ ازواج تھیں۔ جن میں سے دو یعنی حضرت خدیجۃ الکبریٰ[1] رضؓ اور حضرت زینب[2] بنت خزیمہ فوت ہو چکی تھیں اور نو باقی تھیں، جو علیحدہ علیحدہ مکانات میں رہتی تھیں۔ حضورؐ ہر گھر میں باری باری جاتے یعنی ایک رات حضرت عائشہؓ کے ہاں گذارتے۔ دوسری حضرت صفیہ رضؓ کے ہاں تیسری حضرت میمونہ رضؓ کے ہاں۔ وقِس علیٰ ہذا۔ اگر کسی وجہ سے حضورؐ اپنے اس دستور العمل میں کوئی ردو بدل کرنے پر مجبور ہو جاتے، تو جس کی باری ہوتی اُس سے اجازت حاصل کر لیتے۔

اِس تمہید کے بعد اب یہ قول سُنیئے:

عن قتادة عن انس بن

قتادہ کہتے ہیں۔ کہ مجھے انس بن مالک نے

---

[1] سال وفات ۱۰ رمضان سنہ ۱۰ نبوی۔ یعنی ہجرت سے تقریباً اڑھائی سال پہلے
[2] سال وفات سنہ ۳ ھ

مالک قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یدور علی نسائہ فی الساعۃ الواحدۃ من اللیل والنہار وھن احدی عشرۃ قال قلت لانس اوکان یطیقہ قال کنا فتحدث انہ اعطی قوۃ ثلاثین رجالاً۔

بتایا کہ رسول کریم صلعم، دن ہو یا رات ایک ہی وقت میں اپنی گیارہ بیویوں پر گھوم جایا کرتے۔ یعنی اُن سے مجامعت فرمایا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلعم میں اتنی طاقت تھی؟ کہا ہم عموماً یہ باتیں کیا کرتے تھے کہ آپ میں تیس مردوں کی طاقت تھی۔

(بخاری)

ملاحظہ کیا آپ نے حضورؐ کی یہ دلچسپ تصویر۔ اس کی مزید تشریح مشکوٰۃ (ج ۱ ص ۴۹) کی اس حدیث میں ہے کہ حضور صلعم تمام بیویوں سے ایک ہی غسل میں جماع فرمایا کرتے تھے۔

یہ جدول ملاحظہ ہو:

زوجہ مطہرہ کا نام	پہلے شوہر کا نام	پہلے شوہر سے اولاد	حرم نبوی میں کب آئیں	تاریخ وفات	رسول اللہ سے اولاد
خدیجۃ الکبریٰ	۱۔ ابو ہالہ ابن زرارہ ۲۔ عتیق بن عائذ مخزومی	۱۔ ہالہ و ہند ۲۔ ہند	بعثت سے ۱۵ سال پہلے یعنی ۵۹۵ء میں	۱۱۔ رمضان سنہ ۱۰ نبوی (۶۲۰ء)	فاطمہ زینب رقیہ۔ ام کلثوم قاسم۔ طیب عبداللہ۔ طاہر بچوں کے متعلق اختلاف ہے۔

سودہ بنت زمعہ	سکران بن عمرو	عبدالرحمٰن	۱۰ سنہ نبوی	۲۲ سنہ ھ	ندارد
عائشہ بنت ابی بکر	-		۲ سنہ ھ	۵۷ سنہ ھ	"
حفصہ بنت عمر	خنیس بن حذافہ	نامعلوم	۲ سنہ ھ	۴۵ سنہ ھ	"
زینب بنت خزیمہ	عبداللہ بن جحش		۳ سنہ ھ	۳ سنہ ھ	"
ام سلمہ بنت ابی امیہ سہیل	ابو سلمہ	وفات شوہر کے وقت حاملہ تھیں	۴ سنہ ھ	۶۱ سنہ ھ	"
زینب بنت جحش	زید بن حارثہ	علی دامامہ	۵ سنہ ھ	۲۰ سنہ ھ	"
جویریہ بنت حارث بن فرار	مسافع بن صفوان		۵ سنہ ھ	۵۰ سنہ ھ	"
ام حبیبہ بنت ابی سفیان	عبیداللہ بن جحش	عبداللہ و حبیبہ	۶ سنہ ھ	۴۴ سنہ ھ	"
میمونہ بنت حارث	مسعود بن عمرو		۷ سنہ ھ	۵۱ سنہ ھ	"
صفیہ بنت حیی بن اخطب	سلام بن مشکم "	-	۷ سنہ ھ	۵۰ سنہ ھ	"

(سیرت نبوی شبلی۔ و سیر الصحابیات)

اس جدول سے تین باتیں واضح ہیں۔ اول کہ سنہ ۷ھ سے پہلے حضورؐ کے ہاں صرف سات ازواج زندہ تھیں۔ بسنہ ۷ھ میں دو اور کا اضافہ ہوا۔ کل نو۔ زینب بنت خزیمہ نکاح کے بعد صرف تین ماہ زندہ رہی تھیں۔ اور سنہ ۷ھ میں حضورؐ کی عمر ۵۹ برس تھی۔ دوم خدیجۃ الکبریٰ کے

سوا کسی اور بیوی سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ سوم کہ حضرت عائشہ رضی کے سوا باقی نو بیوائیں تھیں، اور ایک مطلقہ۔ اور بعض کی پہلے شوہروں سے اولاد بھی تھی۔

قرآن کہتا ہے:

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ — کہ رسول اللہ تم جیسے بشر ہیں۔

اور ہے بھی درست۔ ہم جیسا قد۔ ہماری طرح ایک دل ایک جگر۔ دو پھیپھڑے۔ نظام جسم ہم جیسا۔ کھانا پینا ہم جیسا۔ رگوں پٹھوں اور شریانوں کی تعداد برابر۔ ہم جیسی فطرت۔ ہم جیسے تقاضے یعنی سرتاپا ہُو بہُو ہم جیسے انسان۔ صرف فرق یہ ہے

کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی!

لیکن حدیث کہتی ہے کہ اُن میں تیس مردوں کی طاقت تھی۔ بہت اچھا۔ ہم مان لیتے ہیں۔ لیکن یہ تو بتلائیے کہ حضرت خدیجہ رضی کے بغیر باقی کسی بیوی سے کیوں اولاد نہیں ہوئی؟ جوان بیویاں۔ حضورؐ میں تیس مردوں کی طاقت اور کوئی اولاد نہ ہو۔ بات کیا تھی؟ کیا سب ازواج بانجھ تھیں؟ اگر تھیں تو ام حبیبہ رضی۔ حضرت زینب رضی۔ حضرت سودہ رضی اور ام سلمہ رضی کے ہاں پہلے شوہروں سے کیسے اولاد ہو گئی تھی؟ اگر آپ یہ کہیں کہ بڑھاپے کی وجہ سے حضورؐ تولید کے قابل نہیں رہے تھے، تو آپ کے محدثین نے ماریہ[1] قبطیہ (لونڈی) کے بطن سے ابراہیم کیسے پیدا کر دیا تھا۔

---

[1] مصر کے والی المقوقس نے حضورؐ کی خدمت میں دو لونڈیاں بھیجی تھیں۔ جن میں سے (باقی صفحہ ۲۳۱ پر)

لونڈی کے پیٹ سے تو رسول ؐ کی اولاد ہو، اور نو بیویوں میں سے کوئی حاملہ تک نہ ہو۔ تعجب ! حیرت !!

میرا خیال یہ ہے۔ کہ حضورؐ نے مدینہ میں آکر ازواج مطہرات کو بطورِ شوہر استعمال ہی نہیں فرمایا تھا۔ اور اس پر کئی قرائن ملتے ہیں۔

اوّل۔ آپ کافی سن رسیدہ ہو گئے تھے۔

دوم۔ کسی بیوی کا حاملہ تک نہ ہونا اس پہ شاہد ہے۔

سوم۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ مصروفیات بڑھ جائیں تو انسان ازدواجی زندگی کے فرائض سرانجام دینے کے لیے نہ وقت نکال سکتا ہے اور نہ اس میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کمال اتاترک اور نپولین جب بہت مصروف ہو گئے، تو ایک ایک بیوی کو بھی مطمئن نہ کر سکے، اور وہ چلتی بنیں۔

بقیہ صفحہ ۲۲۹ ایک بقول راوی آپ نے اپنے گھر میں رکھ لی تھی اور اسی سے ابراہیم پیدا ہوا تھا۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ "خدائے تعالیٰ تین آدمیوں کو دُگنا معاوضہ دیگا۔ اوّل وہ یہودی یا عیسائی جو اپنے رسولوں پہ ایمان لانے کے بعد حضورؐ پر بھی ایمان لے آئے۔ دوم وہ غلام جو خدا اور آقا دونوں کے حقوق ادا کرے اور سوم وہ شخص جو لونڈی کو تعلیم و تربیت دے کر پہلے آزاد کرے اور پھر نکاح کر لے۔" (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۹۹)

یہ تھا رسول ؐ کا ارشاد۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا حضورؐ نے ماریہ قبطیہ کو آزاد کر کے اس سے نکاح کیا تھا۔ اگر ایسا کیا تھا، تو سیرت نگاروں نے آپ کا نام ازواج مطہرات میں کیوں درج نہ کیا۔ اگر نہیں کیا تھا، تو دوسروں کو حکم کیوں دیا ؟

ہٹلر اس قدر مصروف تھا کہ وہ شادی کے معاملے پر سوچنے کی فرصت تک نہ نکال سکا اور ہمارے آقا تو اس قدر مصروف تھے کہ اللہ کی پناہ۔ سنہ ۱ھ میں مسجد کی تعمیر اور قبائل سے معاہدے۔

سنہ ۲ھ میں جنگ بدر سریۂ عطفان اور سریۂ ابو سلمہ۔

سنہ ۳ھ میں مفتوحہ علاقے کا انتظام۔ فوجوں کی اسلحہ بندی۔ راشن وغیرہ کے انتظامات۔ مجروحین و مقتولین کے متعلق تدابیر اور جنگ اُحد۔

سنہ ۴ھ میں جنگ ابی سلمہ۔ جنگ ابن انیس۔ حادثۂ بیر معونہ۔ غزوۂ بنی قینقاع۔ اور غزوۂ بنی نضیر۔

سنہ ۵ھ میں غزوۂ بنی مصطلق۔ غزوۂ خندق۔ جنگ دومۃ الجندل۔ جنگ ذات الرقاع۔ بنو قریظہ کی عہد شکنی۔ منافقین کی بڑھتی ہوئی شرارتیں۔

سنہ ۶ھ میں واقعۂ حدیبیہ۔ والی غسان کی لڑائی کے لیے تیاریاں والیانِ ملک کو دعوتِ اسلام۔

سنہ ۷ھ میں جنگ خیبر۔ سریۂ بشیر بن سعد۔

سنہ ۸ھ میں جنگ موتہ۔ جنگ حُنین۔ جنگ اوطاس۔ جنگ طائف سریۂ عمرو بن عاص۔

سنہ ۹-۱۰ھ میں جنگ تبوک۔ سلطنت کی حد بندی۔ عمال کا تقرر۔ لوگوں کی اصلاح منصبِ قضا کا اجرا۔ تقسیمِ بیت المال کے قوانینِ نظم و نسق

کے لیے تدابیر۔
۱۱ھ میں آفتاب رسالت کا غروب ۔
(سیرت نبوی شبلی)

اگر آپ کو صرف ایک چھوٹی سی لڑائی لڑنا پڑے، تو آپ کو اندازہ ہو جائے کہ کسی جنگ کی تیاری کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ موزون سپاہیوں کا انتخاب۔ رہائش کا بندوبست۔ راشن کا انتظام۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے وسائل۔ صف بندی اور مورچہ آرائی کے لیے موزون مقام کا انتخاب۔ مقتولین کی تدفین۔ کوئی ایک جھمیلا ہے؟ یہ مت بھولیے کہ یہ سب کچھ حضورؐ کو کرنا پڑتا تھا۔ اور ایک ایک سال میں پانچ پانچ چھ چھ مرتبہ۔ اس کے علاوہ حضورؐ کو مقدمات بھی چکانے ہوتے تھے۔ وہ تقریباً رات بھر عبادت بھی کرتے تھے۔ دن کو اندازاً ساڑھے دس بجے تک صلوٰۃ و تلاوت میں محو رہتے تھے۔ اور بعد از زوال پھر مسجد میں تشریف لے آتے تھے۔ ساری قوم کا غم۔ سارے عرب کی فکر۔ دشمنوں کی فتنہ انگیزی سے پریشانی۔ دن بھر روزہ۔ تقریباً رات بھر عبادت۔ خدا کے لیے بتاؤ! کہ انھیں گیارہ بیویوں کے ساتھ مباشرت کی فرصت کیسے مل سکتی تھی؟ اور ان بے اندازہ مصروفیات۔ لاتعداد تفکرات اور بے شمار پریشانیوں میں انھیں مباشرت کی سوجھ ہی کیسے ہو سکتی تھی؟ آپ نے یہ نکاح اس لیے نہیں کیے تھے کہ ان میں تیس مردوں کی طاقت موجود تھی۔ بلکہ اس کی وجوہات کچھ اور تھیں۔ کہیں اس لیے نکاح کیا کہ لڑکی سردار قبیلہ کی بیٹی تھی۔

اور سردار کی معاونت پیشرفت اسلام کے لیے بے حد مفید تھی۔ کہیں اس لیے کہ اُن کے شوہر اللہ کی راہ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اور اُن کا کوئی پرسانِ حال نہ رہا تھا۔ اور کہیں اس لیے کہ بعض عورتیں حضورؐ کا قرب سب سے بڑا اعزاز سمجھتی تھیں حضورؐ دنیا کی تمام لذتوں کو خیرباد کہہ چکے تھے اور آپ کے ساتھ رشتہ بھی ایسی ہی خواتین نے جوڑا جو تمام خواہشات کو ترک کر کے اصلاح و تبلیغ کو مقصدِ حیات بنا چکی تھیں۔

اِس لیے میری رائے میں یہ مباشرت و مجامعت کے قصے تمام من گھڑت ہیں۔ چلتے چلتے ذرا اس حدیث پہ بھی نظر ڈالتے جائیے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرا نکاح رسول اللہ صلعم سے چھ برس کی عمر میں ہُوا تھا۔

وبنیٰ بی وانا بنت تسع سنین (مسلم ج ۳ صـ ۱۴۲)

اور آپ نے مجھ سے نو برس کی عمر میں مجامعت کی۔

یہ مت بھُولیے کہ اُس وقت حضورؐ کی عمر ۵۴ برس تھی۔ اور یہ بھی مت بھُولیے کہ مسلم کی ایک حدیث کے مطابق (ج ۴ صـ ۱۴۲) حضورؐ کے ہاں آنے سے پہلے حضرت عائشہؓ تپ محرقہ میں مہینہ بھر مبتلا رہ چکی تھیں اور آپ کے تمام بال جھڑ چکے تھے۔ نو سال کی بچّی کبھی دیکھی ہے؟ اتنی نابالغ بچّی ہو۔ مہینہ بھر تپ محرّقہ میں مبتلا رہ کر کانٹا ہو چکی ہے کیا ایسی بچی مجامعت کی تاب لا سکتی ہے؟ اور مجامعت بھی ایک ایسے

مرد کے ساتھ جس میں بقول بخاری تیس مردوں کی طاقت تھی۔

ذرا یہ حدیث بھی دیکھیے۔ کسی لڑائی کا ذکر ہے۔

"سبرۃ کہتے ہیں۔ کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے متعہ (متعہ کی تفسیر دہ واقعہ ہے، جو اسی حدیث میں بیان ہو رہا ہے) کی اجازت طلب کی۔ آپ نے دے دی۔ چنانچہ میں اور میرا ایک ساتھی بنی عامر کی ایک عورت کے پاس گئے جو ایک خوبصورت ناقہ کی طرح حسین تھی۔ ہم نے اپنی "خدمات" پیش کیں۔ اُس نے پوچھا کہ "کیا دو گے"؟ میں نے کہا۔ "یہ چادر"۔ پھر میرے ساتھی سے یہی سوال کیا۔ اُس کے پاس بھی صرف چادر ہی تھی۔ اُس کی چادر خوبصورت تھی۔ اور میں خود خوبصورت۔ چنانچہ اُس نے مجھے پسند کیا۔ اور میں اُس عورت کے پاس تین راتیں ٹھہرا۔"

(مسلم ج ۳ صہ ۴۴۳)

تو پھر کیا حکم ہے اُن خواتین کے متعلق جو پیشاور سے چل کر ٹبی بازار[1] میں کچھ ایسے ہی مقاصد کے لیے جاتے ہیں اور کئی کئی راتیں وہیں گذارتے ہیں۔

---

[1] لاہور کا چکلا۔

صحیح مسلم میں ہے۔

انّ رسول اللّٰہ نھٰی یوم الفتح عن متعۃ النساء	کہ رسول اللہ نے فتح خیبر کے دن متعہ سے روک دیا تھا۔

لیکن ص ۴۴۱ پر یہ روایت موجود ہے:

"حضرت جابر کہتے ہیں۔ کہ ہم رسول کریم صلعم اور حضرت صدیق کے زمانے میں مٹھی بھر آٹا یا کھجوریں دے کر عورتوں کو استعمال کیا کرتے تھے اور اس حرکت سے ہمیں عمرو بن حریث کے واقعہ کے بعد حضرت عمرؓ نے روکا تھا۔"

(مسلم ج ۳ ص ۴۴۱)

یہ احادیث نہ صحابہ کی سیرت کے مطابق ہیں اور نہ حضورؐ کے عظیم الشان کردار کے موافق۔ صحابہ کے متعلق قرآن کہتا ہے:

تَرَاھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰاۃِ وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ۔	تم ان صحابہ کو دیکھو کہ وہ ہر وقت اللہ کے سامنے رکوع و سجود میں پڑے الطاف الٰہی کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ سجدوں کی وجہ سے اُن کی پیشانیوں سے نور نکل رہا ہے۔ اور اُن کا (مجملاً) ذکر تورات و انجیل میں بھی موجود ہے۔

اور حضورؐ کی پوری تصویر اس حدیث میں کھینچ دی گئی ہے۔

کان رسول اللّٰہ صلعم	کہ رسول اللہ صلعم ایک پردہ نشین

اشدُّ حیاءً من العذراء فی خدرھا ۔ — کنواری حسینہ سے بھی زیادہ حیادار تھے ۔ (بخاری ج ۲ صـ ۱۱۷۱)

رسول اللہ صلعم کا اپنا ارشاد بھی تھا ۔

لِکُلِّ دِیْنٍ خُلُقٌ ، وخُلُق الاسلام الحیاء ۔ (موطا) — ہر تہذیب کا ایک خاص کردار ہوا کرتا ہے اور اسلام کا امتیازی کردار حیا ہے ۔

حضورؐ اور اُن کے صحابہ کی یہی تصویر تھی، نہ وہ جو اوراقِ گذشتہ میں پیش کی گئی ۔ وصلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین ::

دسواں باب

حدیث میں نماز کی صورت

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اگر حدیث کو مشتبہ اور ظنی قرار دیں تو نماز کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم حدیث سے نماز سیکھنے لگیں، تو شاید نماز کی کوئی صورت قائم ہی نہ ہو سکے۔ اور ہر محلّہ کی نماز دوسرے سے مختلف ہو جائے۔ تمام عالم اسلام میں نماز کی موجودہ متفقہ (تقریباً) ہیئت اس لیے باقی نہیں کہ حدیث معلّم نماز ہے۔ بلکہ اس لیے کہ حدیث سے بچے رہے اور آبا و اجداد کی نقل اُتارتے رہے۔ آیئے اس اجمال کی تفصیل پیش کریں۔

نماز کیسے فرض ہوئی فرضیتِ صلوٰۃ کی داستان بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ حضرت انسؓ کی زبانی سُنیے فرماتے ہیں کہ جب حضورؐ شبِ معراج کو اللہ کے دربار میں حاضر ہوئے تو آپ کی اُمت پر پچاس نمازیں فرض کر دی گئیں۔

قال النبی صلعم ففرض اللہ علیٰ امتی خمسین صلاۃ	حضورؐ فرماتے ہیں کہ اللہ نے میری اُمّت پر پچاس نمازیں فرض کر دیں جب

فرجعت بذالك حتى مررت
على موسىٰ فقال ما فرض لك
علىٰ أمتك قلت فرض خمسين
صلواة قال فارجع الى ربك
فان امتك لا يطيق ذالك
فرجعت فوضع شطرها فرجعت
الى موسىٰ قلت وضع شطرها
فقال ارجع الى ربك فان
امتك لا يطيق ذالك فرجعت
فوضع شطرها فرجعت اليه
فقال ارجع الى ربك فان
امتك لا يطيق ذالك فرجعته
فقال هي خمس وهي خمسون
لا يبدل القول الدى فرجعت
الى موسىٰ فقال ارجع الى ربك
فقلت استحييت من ربى۔

(صحیح بخاری۔ ج ۱
کتاب الصلوٰۃ ص۵۱)

میں دربار خداوندی سے یہ احکام لے کر
واپس آرہا تھا، تو کسی آسمان پر حضرت
موسیٰ سے ملاقات ہوگئی۔ موسیٰؑ نے پوچھا
کہ کتنی نمازوں کا حکم ملا ہے۔ میں نے کہا۔
پچاس کا۔ فرمایا تمہاری اُمت اس بوجھ
کو نہیں اُٹھا سکتی۔ اِسلیے واپس جاؤ
اور تعداد کم کراؤ۔ چنانچہ میں واپس چلا
گیا۔ اور اللہ نے نصف گھٹا دیں۔ پھر
موسےؑ کے پاس گیا۔ اُس نے کہا یہ تعداد
بھی تمہاری اُمت کی طاقت سے بہت
زیادہ ہے اِسلیے دوبارہ واپس جاؤ۔ میں پھر
واپس گیا اور نصف اور کم ہوگئیں۔ جب
سہ بارہ موسےؑ سے ملا تو اُس نے کہا کہ
یہ بھی زیادہ ہیں۔ چنانچہ میں چوتھی مرتبہ
واپس گیا اللہ نے کہا ان پانچ
نمازوں کو پچاس ہی کے برابر سمجھو۔
اور یاد رکھو کہ ہم اپنا قول بدلا نہیں کرتے
جب میں آخری بار موسیٰ کے پاس آیا تو وہ
کہنے لگے ایک مرتبہ اور جاؤ یہ تعداد بھی زیادہ ہے
لیکن میں اللہ سے شرما گیا۔

اِس داستان کا خلاصہ یہ ہؤا۔ کہ امّتِ رسول کی استعداد کا علم نہ خدا کو تھا اور نہ حضورؐ کو۔ اگر موسیٰ علیہ السلام بیچ میں نہ پڑتے تو امّت پہ پچاس نمازیں فرض ہو جاتیں۔ اور یہ اُمت صبح سے لے کر شام تک نمازیں ہی پڑھتی رہتی۔ نہ کھا سکتی۔ اور نہ ضروریاتِ حیات کی طرف توجّہ دے سکتی۔ مجبوراً ہر شخص اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرتا۔ یہ تو حضرت موسیٰ کی عقل کی داد دیجیئے کہ اسلام کو بچا لیا۔ ورنہ خدا و رسول تو یہ "غلطی" کر ہی بیٹھے تھے۔ ماشاء اللہ کیا داستان تراشی ہے۔ کہ حضرت موسیٰ کو خدا و رسول کا معلّم دانش بنا ڈالا ہے۔ اور یہ آخری فقرہ بھی خوب ہے۔" کہ ہم اپنا قول نہیں بدلا کرتے"۔ اگر نہیں بدلا کرتے تو پھر پچاس سے پچیس اور پچیس سے پانچ کیوں کیں۔ اور یہ بھی خوب رہی کہ پانچ کو پچاس ہی کے برابر سمجھو"۔ اور یہ نہ بتایا کہ آیا پچاس کو بھی پانچ کے برابر سمجھ سکتے ہیں یا نہیں۔

وضو فقہ کی بنیاد قرآن و حدیث پر رکھی گئی تھی۔ فقہ بتلاتی ہے۔

(۱) کہ وضو میں اعضا کو تین تین مرتبہ دھونا چاہیئے۔

(۲) کہ مجامعت سے غسل فرض ہو جاتا ہے۔

(۳) کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

(۴) کہ نیند کے بعد وضو ضروری ہے۔

(۵) کہ جنابت کے پانی سے وضو درست نہیں۔

لیکن احادیث کچھ اَور ہی کہتی ہیں۔

ہر نماز کے لیے نیا وضو

عن انس قال کان النبی صلعم یتوضاء عند کل صلواۃ

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ ہر نماز کے لیے نیا وضو کیا کرتے تھے۔

(بخاری ج ۱ صـ۳۵)

تردید بالا ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی خالہ حضرت میمونہ کے گھر میں تھا کہ رسول اللہ صلعم کچھ دیر سو چکنے کے بعد جاگے، وضو کیا، نماز پڑھی۔

ثمّ اضطجع فنام حتی نفخ ثم اتاہ المنادی فاذنہ بالصلوٰۃ فقام معہ الی الصلوٰۃ فصلّی ولم یتوضا۔

(بخاری۔ کتاب الوضو)

پھر آپ لیٹ گئے یہاں تک کہ خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ اس کے بعد نماز کے لیے بلانے والا آیا۔ آپ اس کے ہمراہ مسجد کو چل دیئے اور وہاں جاکر وضو کیے بغیر نماز ادا کی۔

اس حدیث سے دو باتیں واضح ہوگئیں۔ اوّل کہ حضورؐ ہر نماز کے لیے نیا وضو نہیں کرتے تھے۔ دوم۔ کہ نیند کے بعد وضو ضروری نہیں۔ اگر آپ یہ کہیں کہ رسول اکرم کی صرف آنکھیں سوتی تھیں اور دِل جاگتا رہتا تھا۔ اس لیے اُن کے لیے وضو ضروری نہیں تھا۔ اور یہ ہدایت صرف اُمّت کے لیے تھی۔ تو ملاحظہ کیجیے حضرت انس کا یہ قول:

کان اصحاب رسول اللہ صلعم ینامون ثمّ یصلون ولا یتوضوٗن

کہ حضورؐ کے صحابہ سو چکنے کے بعد وضو کیے بغیر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

(صحیح مسلم مع فتح الملہم صـ۵۰)

کیا صحابہ کے دل بھی حضور صلعم کی طرح جاگتے رہتے تھے؟

لہو نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا

حضرت جابر سے روایت ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع میں حضور کی موجودگی میں ایک صحابی تیر سے زخمی ہو گئے اور خون بہہ نکلا لیکن آپ اس حالت میں بھی نماز پڑھتے رہے۔ (بخاری ج ۱ صہ ۳۲)

قال الحسن ما زال المسلمون یصلون فی جراحاتھم وقال طاؤس ومحمد بن علی وعطاء واھل الحجاز لیس فی الدم وضوءٌ۔

حسن کہتے ہیں کہ مسلمان ہمیشہ زخمی ہو کر بھی نماز پڑھتے رہے۔ طاؤس۔ محمد بن علی۔ عطا اور اہل حجاز کی رائے یہ ہے کہ لہو نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

(بخاری ج ۱ صہ ۳۲)

ایک سوال

کیا مجامعت کے بعد غسل ضروری ہے؟

کتبی جواب

" زید بن خالد نے حضرت عثمانؓ سے دریافت کیا۔ کہ اگر کوئی شخص مجامعت کرے۔ لیکن انزال سے پہلے علیحدہ ہو جائے، تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ فرمایا۔ شرمگاہ کو دھو ڈالے اور وضو کر لے۔"

(بخاری کتاب الوضو صہ ۴۳)

(۲) "دخول کے بعد غسل واجب ہو جاتا ہے۔" (موطا صہ ۲۲)

(۳) "ابو ہریرہؓ کہتے ہیں۔ رسول اللہ نے فرمایا تھا۔ کہ جب کوئی آدمی بیوی کی لاتوں میں بیٹھ کر زور لگانا شروع کر دے، تو اس پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔ خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔"

(صحیح مسلم ج ا۔ باب الوضو صہ ۴۸۵)

(۴) "ابی بن کعب کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا۔ کہ اگر کوئی شخص مجامعت کرے، اور انزال سے پہلے علیحدہ ہو جائے تو کیا وہ غسل کرے؟ فرمایا۔ وہ صرف وضو کر کے نماز پڑھ لے۔"

(مسلم ج ا۔ صہ ۴۸۵)

کیا سمجھے؟ ..... دخول کے بعد غسل ضروری ہے یا غیر ضروری؟

کیا غسل سے بچے ہوئے پانی سے وضو جائز ہے؟

(۱) ناجائز ہے:

ان رسول اللہ نھی ان یتوضا الرجل بفضل طھور المراۃ۔

عورت کے غسل سے بچے ہوئے پانی کو وضو کے لیے استعمال کرنے سے رسول اللہ نے روک دیا ہے۔

(ترمذی وابن ماجہ نیز فتح الملہم ج ا صہ ۴۷۳)

(۲) جائز ہے:

(الف) عن ابن عباس ان رسول اللہ کان یغتسل بفضل میمونہ (مسلم ج۱۔ ص۱۴۳)

ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضورؐ حضرت میمونہ کے غسل سے بچے ہوئے پانی سے نہایا کرتے تھے۔

(ب) عن ابن عباس قال اغتسل بعض الازواج فی جفنۃ فجاء النبی لیتوضا او یغتسل فقالت لہ یا رسول اللہ انی کنت جنبا قال ان الماء لا یجنب

(ترمذی)

ابن عباس سے روایت ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کوئی ایک بڑے برتن میں نہاتیں۔ اسکے بعد حضورؐ وضو یا غسل کے لیے گھر تشریف لائے تو زوجۂ محترمہ نے کہا اے رسول اللہ! میں اس پانی میں غسل کر چکی ہوں اور میں جنابت کی حالت میں تھی۔ فرمایا۔ پانی جنبی (جنابت زدہ) نہیں ہوا کرتا۔

کیا آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

(۱) ٹوٹ جاتا ہے۔

عن زید بن ثابت قال سمعت رسول اللہ صلعم یقول الوضوء مما مست النار

زید بن ثابت کہتے ہیں۔ کہ میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد نیا وضو ضروری ہے۔

(مسلم ج ۱۔ ص۱۵۶)

(۲) نہیں ٹوٹتا:

عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ اکل کتف شاۃ ثم صلّی ولم یتوضاء (صحیح مسلم ج ۱ صفحہ ۱۵۶)

ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور نے ایک بکری کا بھنا ہوا بازو تناول فرمایا اور پھر وضو کیے بغیر نماز پڑھ لی۔

تکبیر اقامت

ہم قیام صلوٰۃ کے وقت "اقامت" میں ہر "تکبیر دو مرتبہ کہتے ہیں۔ لیکن مسلم میں درج ہے،

أمر بلال ان یشفع الاذان ولیوتر الاقامۃ (مسلم مع فتح الملہم ج ۲ صفحہ ۳)

حضرت بلال کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اذان کی تکبیریں دو دو مرتبہ اور اقامت کی صرف ایک مرتبہ کہے۔

نماز میں صرف سورۂ فاتحہ کافی ہے

ہم پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی سورہ بھی پڑھتے ہیں۔ لیکن مسلم میں درج ہے۔ کہ ایک شخص نے ابو ہریرہؓ سے پوچھا کہ کیا فاتحہ کے ساتھ کوئی سورہ پڑھنا ضروری ہے؟ کہا

ان زدت علیہا فھو خیر وان انتھیت الیھا اجزأت عنك (مسلم مع فتح الملہم ج ۲ صفحہ ۳۱)

اگر کوئی سورہ پڑھ لو تو اچھا ہے ورنہ فاتحہ ہی کافی ہے

اور ہمارے ائمۂ فقہ کہتے ہیں کہ صرف فاتحہ سے نماز مکمل نہیں ہوتی۔

کیا کلماتِ ثنا و تقدیس ضروری ہیں

ہمارا امام سبحانك اللّٰھم وبحمدك .... لا الٰہ

غیرک دل میں پڑھتا ہے۔ لیکن مسلم میں عبدہ سے روایت ہے کہ

ان عمر بن الخطاب کان یجھر بھؤلاء الکلمات سبحانک اللھم ..... | کہ حضرت عمر کلماتِ تقدیس (سبحانک اللھم) کو بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

(مسلم ج ۲ ص ۳۸)

بلکہ ایک روایت کے مطابق حضورؐ اور اُن کے صحابہ نماز کی ابتدا فاتحہ سے کرتے تھے۔ اور سبحانک اللھم ..... کو چھوڑ جاتے تھے۔

عن انس قال صلیت خلف النبی و ابی بکر و عمر و عثمان فکانوا یستفتحون بالحمد للہ رب العالمین | انس کہتے ہیں کہ میں رسول کریم صلعم ابوبکر۔ عمر اور عثمان کے پیچھے نماز پڑھتا رہا۔ یہ حضرات نماز کا آغاز ہی فاتحہ سے کیا کرتے تھے۔

(مسلم ج ۲ ص ۳۸)

"افتتاح" کے معنی ہیں آغاز کرنا۔ شروع کرنا۔ اور شروع کا مفہوم یہی ہے کہ اس سے پہلے کوئی اور چیز نہ ہو

نماز میں مختلف اعمال کی اجازت

ہمیں نماز میں رکوع و سجود و قیام و قعود کے بغیر کسی اور عمل کی اجازت نہیں۔ لیکن بخاری میں ہے۔

"سہل بن سعد کہتے ہیں کہ جب مسجدِ نبوی کے لیے منبر تیار ہوا تو حضورؐ اس پر چڑھ گئے۔ مُنہ قبلہ کی طرف پھیر لیا۔ تکبیر کہی۔ لوگوں نے پیچھے صفیں باندھ لیں۔ قرأت کے بعد رکوع میں

گئے۔ رکوع کے بعد نیچے اُتر آئے۔ زمین پہ سجدہ کیا اور پھر منبر پر چڑھ گئے۔ اور رکوع کے بعد پھر سجدے کے لیے زمین پر اُتر آئے۔" (بخاری ج ا صـ۵۳)

"ابوقتادہ الانصاری سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے اپنی دختر زینبؓ کی بیٹی امامہ کو اٹھا کر نماز شروع کر دی جب سجدے میں جاتے تو اُسے زمین پر رکھ دیتے، اور جب اُٹھتے تو پھر اُٹھا لیتے۔" (بخاری ج ا۔ صـ۶۹)

کیا نمازی کے سامنے سے گذرنا ممنوع ہے؟

فقہا کے ہاں دوران نماز میں نمازی کے سامنے سے گذرنا ممنوع ہے۔ بخاری میں ابوسعید سے روایت ہے:

"کہ اگر کوئی شخص کسی نمازی کے سامنے سے گذر رہا ہو تو اُسے روکو۔ اگر نہ رُکے فلیقاتلہ فانما ھو شیطان۔ تو اس سے باقاعدہ جنگ کرو۔ اِس لیے کہ وہ شیطان ہے۔"

(بخاری ج ا۔ صـ۶۸)

لیکن ابن عباسؓ کہتے ہیں:

"کہ مَیں گدھی پر سوار ہو کر منیٰ میں پہنچا۔ رسول اللہ صلعم نماز پڑھا رہے تھے۔ میں کچھ نمازیوں کے سامنے سے گذر کر گدھی سے اُترا۔ گدھی کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ خود نماز میں شامل

ہوگیا۔ اور کسی نے بُرا نہ مانا۔" (بخاری ج ۱۔ صـ۱۰۱)

اِسی طرح کی ایک روایت موطا میں بھی ہے:

انّ سعد بن ابی وقاص	کہ نماز کے دوران میں سعدؓ بن ابی وقاص
کان یمرّ بین یدی بعض	نمازیوں کی صفوں کے سامنے سے گذر
الصفوف والصلوٰۃ قائمۃٌ	جاتے تھے۔ (موطا صـ۵۵)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فیصلہ ہے:

لا یقطع الصّلوٰۃ شیئٌ ممّا	کہ چیز کے سامنے گذر جانے سے نماز
یمرّ بین یدی المصلّی۔	باطل نہیں ہوتی۔ (موطا صـ۵۵)

مُسلم کی ایک حدیث ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال	ابوہریرہ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں
رسول اللہ صلعم یقطع الصّلوٰۃ	کہ عورت، گدھا اور کتا سامنے آجائیں تو
المرأۃ والحمار والکلب	نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ (مسلم ج ۲ صـ۱۱۱)

لیکن حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

کنت انام بین یدی	کہ میں نماز میں حضورؐ کے سامنے پاؤں
رسول اللہ صلعم ورجلای	پھیلا کر لیٹ جاتی تھی۔ جب وہ سجدہ
فی قبلتہٖ فاذا سجد غمزنی	کرنے لگتے تو مجھے چوکا لگا دیتے چنانچہ
فقبضت رجلی فاذا قام	میں پاؤں سمیٹ لیتی اور جب وہ اُٹھتے
بسطتہما والبیوت لیس	تو پھر پھیلا دیتی۔ اور گھر میں چراغ موجود
فیہا مصابیح	نہیں ہوتا (یعنی بالکل اندھیرا تھا)

(بخاری ج ۱ صـ۵۵)

اس روایت کے مطابق حضرت عائشہؓ حضورؐ کے مصلّے پر لیٹی ہوتی تھیں۔ اور پہلی کے مطابق عورت کے سامنے آنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ کس کو صحیح سمجھیں؟ جب حضرت عائشہؓ کے سامنے مسلم والی حدیث بیان کی گئی، تو آپ نے فرمایا:

قد شبھتمونا بالحمیر والکلاب واللہ لقد رایت رسول اللہ صلعم یصلی وانی علی السریر بینہ وبین القبلۃ مضطجعۃ۔	تم لوگوں نے ہم عورتوں کو گدھوں اور کتوں جیسا سمجھ لیا ہے۔ خدا کی قسم میں رسول اللہ صلعم کے سامنے چارپائی پہ لیٹی ہوتی ہوتی تھی اور وہ نماز ادا کیا کرتے تھے۔

(مسلم ج ۲ ص۱۱)

بدیگر الفاظ حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کی صحت سے انکار کر دیا ہے اور پھر بھی یہ "صحیح مسلم" کا جزو بنی ہوئی ہے۔

رفع یدین حنفی رکوع سے پہلے یا بعد ہاتھ نہیں اٹھاتے لیکن بخاری میں پوری چار احادیث اس مضمون پہ ملتی ہیں۔ کہ حضورؐ رکوع سے پہلے اور بعد نیز درمیانی التحیات سے اُٹھ کر ہاتھ اُٹھایا کرتے تھے۔

(ملاحظہ ہو بخاری باب الصلوٰۃ جلد ا ص۹۳)

جمع صلاتین ہم بلا وجہ ظہر و عصر اور عشا و مغرب کی نمازوں کو جمع نہیں کر سکتے۔ لیکن موطا میں حضرت عبداللہؓ بن عباس سے روایت ہے:

صلی لنا رسول اللہ صلعم الظھر والعصر جمیعاً والمغرب والعشاء جمیعاً من غیر خوف ولا سفر۔ — کہ حضورؐ نے بغیر کسی خوف یا سفر کے نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشا کو اکٹھا کر لیا تھا۔

(موطا صفحہ ۱۵۱۔ نیز مسلم ج ۲، ص ۲۶۵)

کیا نماز میں انسانی کلام کی اجازت ہے؟

معاویہ بن الحکم السلمی کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلعم کے ہمراہ نماز ادا کر رہا تھا۔ کہ ایک نمازی کو چھینک آگئی۔ میں نے نماز کے دوران میں کہہ دیا "یرحمک اللہ (خدا تم پر رحم کرے) نماز کے بعد حضورؐ نے فرمایا ان ھذہ الصلوٰۃ لا یصلح فیھا شیء من کلام الناس۔ کہ نماز میں انسانی کلام جائز نہیں۔"

(مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۲۶)

لیکن ابی الدرداء روایت کرتے ہیں:

"کہ ایک مرتبہ نماز کے دوران میں حضورؐ کے سامنے شیطان آگیا تو آپ نے تین مرتبہ کہا العنک بلعنۃ اللہ تم پر اللہ کی لعنت۔"

(مسلم ج ۲ ص ۱۳۱)

یعنی حضورؐ کے لیے نماز میں انسانی کلام جائز، اور دوسروں کے لیے ناجائز۔

ایک اور حدیث میں وارد ہے کہ

"حضورؐ نماز عشا ادا فرما رہے تھے۔ رکوع سے اٹھنے کے بعد

آپ کہنے لگے "اے اللہ عیاش بن ابی ربیعہ اور دیگر غریب مسلمانوں پر رحم کر۔ قبیلہ مضر کو اپنی گرفت میں لے لے اور انھیں قحط میں مبتلا کر" (مسلم ج ۲ صـ۲۳۶)

یہ انسانی کلام نہیں تو اور کیا ہے؟

دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھانا

ہم دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔ لیکن حضرت انس کہتے ہیں:

کان النبی صلعم لا یرفع یدیہ فی شئ من الدعاء الا فی الاستسقاء۔

کہ حضورؐ بارش کی دعا کے بغیر کسی اور دعا میں ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے۔

(بخاری ج ۱۔ صـ۱۲۵)

جوتوں سمیت نماز

ہم جوتے اُتار کر نماز ادا کرتے ہیں لیکن سعید بن یزید الازدی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس سے پوچھا کہ

اکان النبی صلعم یصلّی فی نعلیہ۔ قال نعم

کیا حضورؐ جوتوں سمیت نماز پڑھتے تھے کہا۔ ہاں۔ (بخاری ج ۱ صـ۵۵)

پہلی رکعت کے بعد بیٹھنا

ہم پہلی رکعت کے بعد سیدھے اُٹھ جاتے ہیں۔ لیکن مالک بن الحویرث کہتے ہیں:

اذا رفع راسہٗ من السجدۃ الثانیۃ جلس و اعتمد علی الارض ثمّ قام۔

کہ حضورؐ دوسرے سجدے سے سر اُٹھانے کے بعد پہلے آرام سے زمین پر بیٹھ جاتے اور پھر اُٹھتے۔ (بخاری ج ۱ صـ۱۰۳)

نماز چھوٹی ہو یا لمبی حضور مختصر نماز کو پسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے لمبی نماز پڑھائی تو آپ نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا:

ان منکم منفرین۔ تم لوگوں کو نماز سے متنفر کرتے ہو۔

(مسلم ج ۲ صفحہ ۵۸)

حضرت انس کہتے ہیں کہ حضورؐ

کان من اخف الناس سب سے زیادہ مختصر اور مکمل نماز پڑھا

صلواۃ فی تمام کرتے تھے۔ (مسلم ج ۲ صفحہ ۵۶)

حضرت انس ہی کی روایت ہے۔

ان النبی کان یوجز فی کہ حضورؐ نہایت مختصر نماز پڑھا کرتے

الصلواۃ۔ تھے۔ (مسلم ج ۲۔ صفحہ ۵۶)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ

معاذ بن جبل الانصاری نے نماز عشا کو بہت لمبا کر دیا چنانچہ ایک نمازی نماز چھوڑ کر چلا گیا۔ بعد میں جب معاذ کو پتہ چلا تو کہا کہ وہ منافق ہے۔ وہ شخص فریاد لے کر حضورؐ کے دربار میں آیا تو آپ نے معاذ کو بلا کر کہا۔

انتزید ان تکون فتانا یا معاذ ....

اے معاذ! تم اسلام میں فتنہ پھیلانا چاہتے ہو۔ آیندہ جب کبھی امامت کرو، تو چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھا کرو۔" (مسلم ج ۲ صفحہ ۴۲)

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھیے!

وہی انس جن کی دو روایات اختصارِ نماز کے متعلق اوپر دی جا چکی ہیں بیان کرتے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلعم کی نماز اتنی لمبی ہوتی تھی کہ

اذا رفع راسہ من الرکوع	جب وہ رکوع سے سر اُٹھاتے تھے
انتصب قائما حتی یقول	تو اتنی دیر کھڑے رہتے تھے کہ دیکھنے
القائل قد نسی و اذا رفع	والا یہ سمجھتا کہ آپ بھول گئے ہیں اور
راسہ من السجدۃ مکث	سجدہ کے بعد بھی اُن کی یہی حالت
حتی یقول القائل قد نسی۔	ہوتی تھی۔

(مسلم ج ۲ - ص۴۸)

جو کسر باقی تھی اُسے حضرت ابو سعید الخدری پورا کرتے ہیں۔ کسی نے ابو سعید سے رسول اللہ صلعم کی نماز کے متعلق سوال کیا۔ تو آپ نے کہا:

کانت صلوٰۃ الظہر تقام	رسول اللہ صلعم کی نماز اتنی لمبی ہوتی تھی
فینطلق احدنا الی البقیع	کہ فرض کیجیے نماز ظہر شروع ہو چکی ہے
فیقضی حاجتہ ثم یاتی اھلہ	ایک شخص پہلے بقیع میں جاتا ہے۔ وہاں
فیتوضأ ثم یرجع الی المسجد	سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا ہے۔ وضو کرتا
ورسول اللہ صلعم فی الرکعۃ	ہے۔ پھر مسجد میں جاتا ہے اور حضورؐ ابھی
الاولیٰ۔ (مسلم ج ۲ ص۴۹)	پہلی رکعت ہی پڑھا رہے ہوتے تھے۔

کہیئے۔ ان احادیث کی روشنی میں آپ نماز لمبی پڑھیں گے یا چھوٹی؟

چند اور اختلافات

ہماری موجودہ نماز کی تصویر آپ کے سامنے ہے۔ پہلے ثناء پھر سورۂ فاتحہ پھر چند آیات۔ پھر التحیات میں درود، دعا اور سلام۔ لیکن رسول اللہ صلعم کی نماز ہم سے بوجوہ مختلف تھی۔

(۱) بقول حضرت عائشہ رض حضورؐ سجدہ میں یہ دعا پڑھتے تھے:

سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص۹۹)

(۲) آپ نماز میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

اللھم انی اعوذبک من عذاب القبر.. کافی لمبی دعا ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص۱۰۴)

(۳) حضرت ابوبکر صدیق رض فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت نے نماز میں یہ دعا پڑھنے کی ہدایت فرمائی تھی:

اللھم انی ظلمت نفسی...... انت الغفور الرحیم۔

(بخاری ج ۱۔ ص۱۰۴)

(۴) عبداللہ بن اوفی لکھتے ہیں کہ حضورؐ رکوع کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

ربنا لک الحمد ملئ السماء وملء الارض ..... لمبی دعا ہے۔

(مسلم ج ۲ ص۹۱)

(۵) ابن عباس کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ہم کو التحیات یوں پڑھایا تھا:

التحیات المبارکات الصلوات الطیبات للّٰہ ۔ (مسلم ج ۲ ص ؟)

(۶) ابو حمید الساعدی نے حضورؐ سے پوچھا کہ نماز میں ہم آپ پر کس طرح صلوٰۃ بھیجا کریں۔ کہا اس طرح:

اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ ازواجہ و ذریتہ کما بارکت علیٰ آل ابراھیم و بارک علیٰ محمد وازواجہ و ذریتہ کما بارکت علیٰ آل ابراھیم۔ (مسلم ج ۲ ص ۴)

(۷) حضورؐ فرماتے ہیں کہ جب تم التحیات "عبدہٗ ورسولہٗ" تک پڑھ چکو تو پھر جو جی میں آئے دعا مانگو۔ (مسلم ج ۲ ص ۴)

ماحصل تو گویا حدیث کی رو سے نماز کی شکل یہ قائم ہوئی:

اوّل۔ خون بہہ رہا ہو۔ یا آپ نیند میں خرّاٹے لے رہے ہوں، تب وضو کی ضرورت نہیں۔

دوم۔ آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن بکری کے کبابوں سے نہیں ٹوٹتا۔

سوم۔ مجامعت میں اگر انزال نہ ہو، تو صرف وضو کرکے نماز پڑھ لیجیے۔

چہارم۔ رسول اللہ کا عمل یہ ہے۔ کہ ہر نماز کے لیے وضو کرو اور یہ بھی کہ سو کر جاگو تو بے وضو نماز پڑھ لو۔

پنجم۔ آپ بلاوجہ ظہر و عصر اور عشا و مغرب کو جمع کر سکتے ہیں۔

ششم۔ دعا کے لیے ہاتھ مت اٹھاؤ۔

ہفتم۔ رکوع سے پہلے اور بعد رفع یدین کیا کرو۔ یعنی ہاتھ کندھوں تک

اُٹھایا کرو۔

ہشتم۔ عصر کے بعد دو رکعت ضرور پڑھا کرو۔

نہم۔ اگر جی چاہے تو اپنا بچہ گود میں لے کر نماز پڑھ سکتے ہو بیٹھ بھول پر نماز شروع کر کے سجدے کے لیے زمین پر اُتر سکتے ہو۔ اور پھر اوپر جا سکتے ہو۔

دہم۔ نماز میں صرف فاتحہ پڑھنا کافی ہے۔

یازدہم۔ کلمات ثنا بلند آواز سے پڑھا کرو۔ اور چاہو تو ثنا کے بغیر بھی نماز پڑھ سکتے ہو۔

دوازدہم۔ نماز میں شیطان پہ لعنت بھیج سکتے ہو۔ اور مظلوموں کے لیے دعا بھی کر سکتے ہو۔

سیزدہم۔ التحیات کے بعد جو چاہو کہو۔

چہاردہم۔ اگر کوئی شخص نماز کے سامنے سے گذر رہا ہو، تو اُسے مار ڈالو۔ ہاں اگر حضرت ابن عباسؓ یا سعد بن ابی وقاصؓ ہوں تو چھوڑ دو

پانزدہم۔ عورت۔ گدھا یا کتا سامنے آجاتے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ کی بیگم صاحبہ جائے نماز پہ لیٹی ہوئی ہوں تو کوئی حرج نہیں۔

تو یہ ہے حدیث کی نماز! کیا آپ یہی نماز پڑھا کرتے تھے۔ اگر نہیں تو پھر آپ کس منہ سے کہا کرتے ہیں کہ اگر حدیث نہ رہے تو نماز کا نام و نشان مٹ جاتے۔ آپ حدیث کی نماز سے کوسوں بھاگتے بھی ہیں اور

پھر حدیث کو شانِ صلوٰۃ بھی کہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بڑا معمہ کون سا ہے آپ یا آپ کی حدیث . . . ! ؎

فتنۂ ملّت بیضا ہے امامت اُس کی
جو مسلماں کو روایت کا پرستار کرے

(اقبالؒ بہ ترمیم)

گیارہواں باب

بہترین عمل

ہم عرض کر چکے ہیں۔ کہ مسلمان اللہ کا سپاہی ہے جس کا کام جان و مال اور اولاد و وطن کو اللہ کے نام پہ قربان کرنا ہے۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں۔ دل کے ٹکڑوں کو آنکھوں کے سامنے کٹوا دینا اور اُف نہ کرنا۔ گھر بار کو لات مار کر وادیٔ غربت میں خانہ بدوش پھرنا، اور حرفِ شکایت لب پہ نہ لانا۔ پشتوں کی جمع کی ہوئی دولت، ملت پہ قربان کر دینا اور افلاس و نکبت سے نہ ڈرنا۔ جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود پڑنا۔ سینے پہ بھالے کھانا۔ چٹانوں سے کود کر پاش پاش ہو جانا۔ اور خنجرِ قاتل کو یہ کہتے ہوئے چومنا ؎

سر کے کٹ جانے کا مجھ کو غم نہیں
خم نہ آ جائے تری تلوار میں!

کوئی مذاق نہیں۔ بلکہ دنیائے عشق کی سب سے بڑی ابتلا۔ اور اِس مشتِ خاک کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اور اسی لیے سب اعمال سے زیادہ اجر کا مستحق۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَائِزُوْنَ ۔ (قرآن)	جو مومن اللہ کے راستے میں گھر بار مال اور جان قربان کر دیتے ہیں۔ ہم انھیں سب سے زیادہ اجر دیتے ہیں۔ اور یہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔

یہی لوگ اللہ کے ہاں عزّت پاتے ہیں۔ اور انھیں سے وہ محبّت کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۔	اللہ اُنہی لوگوں سے محبّت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں یوں جم کر لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

(قرآن)

نہ صرف اُن سے محبّت کرتا ہے۔ بلکہ انھیں عزّت۔ بلندی، پاکیزگی اور شاندار زندگی کی راہیں دکھاتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (قرآن)	جو لوگ ہماری خاطر جہاد کرتے ہیں۔ ہم اُنھیں خدائی راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔

مسلمان کی منزل مہ و پروین سے بہت آگے ہے۔ وہ اس بلند منزل تک پہنچنے کے لیے کبھی طوفان بن کر اُبھرتا ہے۔ کبھی بجلی بن کر لپکتا ہے کبھی علم کے پر لگا کر اُڑتا ہے۔ اور کبھی جان دے کر جاناں تک پہنچتا ہے ؎

چوں ذرّہ بہ خورشید درخشاں پیوست
چوں قطرۂ سرگشتہ بہ عماں پیوست
جاں بود میاں دست و جاناں حائل
فی الحال کہ جاں داد بہ جاناں پیوست

قربانی تعلیمات اسلام کا مرکزی نقطہ ہے۔ اور ہماری تمام اعمال وہ خطوط ہیں جو اسی مرکز کو جاتے ہیں۔ ہماری نماز صف بندی کا سبق ہمارے روزے جفاکشی کا درس۔ ہماری زکوٰۃ جاں نثاری کی طرف پہلا قدم۔ ہماری توحید شیرازہ بندی ملّت کا پیغام۔ اور ہمارا حج وحدتِ افکار و اعمال کا آئینہ۔ الغرض جس عمل کو دیکھو وہ تنظیم و تقویٰ کا سبق دے رہا ہے۔ اور عشق کی آخری منزل یعنی جاں سپاری کے لیے تیار کر رہا ہے ؎

بہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

میرا یہ محکم یقین ہے کہ جس شخص کا اسلام اسے مرنے کی دعوت نہیں دیتا وہ اسلام نہیں کچھ اور بلا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ

اہلِ ایمان وہی ہیں جنھوں نے وطن چھوڑا ہماری راہ میں جہاد کیا۔ دوسروں کو پناہ دی اور بیکسوں کی مدد کی۔ ہم اُن۔ بہ مغفرت اور رزقِ کریم کا

مَّغۡفِرَةٌ وَّ رِزۡقٌ كَرِيۡمٌ (قرآن)   وعدہ کرتے ہیں۔

تفاصیلِ بالا سے یہ بات واضح ہوگئی ہے۔ کہ اللہ کے نزدیک جہاد بلند ترین عمل اور بہترین اجر کا مستحق ہے۔ جب کسی بُزدل نے دیکھا۔ کہ مسلمان بننے کے لیے جان دینا پڑتی ہے، تو اُس نے بعض دیگر اعمال کی افضلیت پر احادیث گھڑنا شروع کر دیں اور جہاد کی وقعت کو گھٹا کر کہیں تو اُسے تیسرے یا چوتھے درجے کا عمل بنا دیا۔ اور کہیں اچھے اعمال کی فہرست ہی سے خارج کر دیا۔ مثلاً

(۱) عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے۔ کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کہ کون سا اسلام اچھا ہے۔ فرمایا کھانا کھلانا اور آشنا و ناآشنا سب کو پہلے سلام کہنا۔   (بخاری باب۔ ایُّ الاسلام افضل ج ۱ صٓ)

(۲) ابو موسیٰؓ سے روایت ہے۔ آنحضرت سے پوچھا گیا کہ کون سا اسلام اچھا ہے۔ فرمایا: مسلمان کو زبان اور ہاتھ سے دُکھ نہ پہنچانا۔

(بخاری ج ۱ صٓ)

ان دو احادیث میں تو جہاد کا ذکر ہی نہیں اب ایسی احادیث سنئیے جن میں جہاد کو دوسرے و تیسرے یا چوتھے درجے کی نیکی بتایا گیا ہے۔

(۳) عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرتؐ سے پوچھا۔ کہ سب سے بہتر عمل کون سا ہے۔ فرمایا: نماز بہ پابندیٔ وقت۔ اس کے بعد والدین کی خدمت اور اس کے بعد جہاد۔   (بخاری ج ۲ ص۸۹)

(۴) کسی شخص نے حضورؐ سے پوچھا۔ کہ بہترین عمل کون سا ہے۔ فرمایا: خدا

ورسول پر ایمان۔ اس کے بعد جہاد۔ اور اس کے بعد حج"۔

(بخاری ج ۱ صلاً)

قرآن کہتا ہے کہ جنّت جان و مال کی قربانی سے ملے گی:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔	اللہ نے مسلمانوں سے جان و مال لے کر اس کے عوض میں انھیں جنّت دیدی ہے۔
اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا مِنْکُمْ	تمہارا یہ خیال ہے کہ تم جنّت میں جہاد کیے بغیر پہنچ جاؤ گے۔ غلط ہے۔ (قرآن)

لیکن حدیث کا فیصلہ ہے۔ کہ جہاد کرو یا نہ کرو جنّت تمہاری ہے۔

(۵) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلعم من آمن باللہ وبرسولہ واقام الصلوٰۃ و صام رمضان کان حقاً علی اللہ ان یدخلہ الجنۃ جاھد فی سبیل اللہ اوجلس فی ارضہ التی ولد فیھا	ابوہریرہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ جو شخص خدا و رسول پر ایمان لائے۔ نماز پڑھے اور روزے رکھے اللہ کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے جنّت میں بھیجے خواہ وہ جہاد کرے یا گھر ہی میں بیٹھا رہے.... (بخاری ج ۲ صفحہ)

ابن ماجہ اور ترمذی کی ایک حدیث ملاحظہ ہو۔

(۶) "کیا میں تمھیں بتاؤں کہ سب سے بہتر عمل کون سا ہے۔ ایسا عمل جو تمھارے درجوں کو بلند کر دے، جو سونے اور چاندی کی قربانی سے بہتر ہو، اور اُس جہاد سے بھی اچھا ہو۔ جس میں تم دوسروں کی گردنیں کاٹتے اور اپنی کٹاتے ہو۔ لوگوں نے کہا بتائیے۔ کہا اللہ کا ذکر۔" (نیز موطا)

سب سے زیادہ اللہ کا ذکر ایک بھکاری کیا کرتا ہے۔ جو ایک ایک سانس میں دس دس مرتبہ اللہ کا نام لے کر بھیک مانگتا ہے تو گویا اس حدیث کی رُو سے بھکاری بہشت کے ٹھیکیدار اور سردار ہوں گے۔ اور ہم تم سب اُن کے خدمتگار۔

یہ نہ سمجھیے کہ افضلیتِ جہاد پر حضورؐ کا کوئی قول موجود ہی نہیں۔ بہتیرے ہیں۔ لیکن ہمارے واعظین انھیں چھپاتے رکھتے ہیں۔ تاکہ اُن کا ذکر۔ وِرد۔ تسبیح اور جنتر منتر والا "پاک اور خالص" مذہب ان مشکل اعمال کی آمیزش سے "ناپاک" نہ ہو جائے۔ مثلاً ملاحظہ ہوں یہ احادیث:

عن ابی سعید الخدری قال قیل یا رسول اللہ ای النّاس افضل فقال مومن یجاھد فی سبیل اللہ بنفسہ ومالہ۔	ابو سعید الخدری سے مروی ہے کہ حضورؐ سے کسی نے پوچھا کہ بہترین لوگ کون سے ہیں۔ فرمایا۔ وہ مومن جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد ج ۲ صفہ ۹)

لغدوة فی سبیل اللہ او روحة خیر من الدنیا و ما فیھا

اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام صرف کرنا دنیا کا بہترین عمل ہے۔

(بخاری کتاب الجہاد)

والذی نفسی بیدہ لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا ثم اقتل۔ ثم احیا ثم اقتل۔ ثم احیا ثم اقتل۔

(بخاری کتاب الجہاد)

آنحضرت فرماتے ہیں۔ اللہ کی قسم میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں۔ پھر جیوں پھر شہادت پاؤں پھر جیوں پھر شہادت پاؤں۔ پھر جیوں اور پھر شہید ہو جاؤں۔

ما اغبرت قدما عبد فی سبیل اللہ فتمسہ النار۔

اُن پاؤں کو آگ ہرگز نہیں چھوئے گی جو اللہ کی راہ میں غبار آلود ہو جائیں۔

(بخاری کتاب الجہاد)

اعلموا ان الجنة تحت ظلال السیوف۔

اس حقیقت کو سمجھ لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔

(بخاری)

الخیل معقود فی نواصیھا الخیر الیٰ یوم القیامة۔

گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک برکت رہے گی۔ (بخاری ج ۲ ص ۹۶)

من احتبس فرسا فی سبیل اللہ ایمانا باللہ وتصدیقا بوعدہ فان شبعہ وریہ و

جو شخص جہاد کی خاطر اور اللہ کے لیے گھوڑا پالے گا۔ قیامت کے دن اس گھوڑے کی غذا پانی لید اور پیشاب

ورثه و بوله فی میزانه یوم القیامة۔	تک اُس کے نیک اعمال کے ہمراہ تولے جائیں گے۔

(بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۶)

رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما علیها	اپنی سرحدوں پر ایک دن پہرہ دینا دنیا کا بہترین عمل ہے۔ (بخاری ج۲ صفحہ)
ارموا بنی اسمٰعیل فان اباکم کان رامیًا۔ (بخاری کتاب الجہاد ج ۲ صفحہ)	اسمٰعیل کے بیٹو۔ تیراندازی میں کمال پیدا کرو۔ اس لیے کہ تمہارا باپ بھی تیرانداز تھا۔

اگر حضورؐ اس وقت موجود ہوتے تو تیراندازی کی طرح گولہ باری، ہوا بازی اور جہاز رانی کو بھی جزوِ مذہب بنا دیتے۔ اُس وقت مسلمان کا مقابلہ تیر، تلوار اور برچھے سے تھا۔ اور آج طیاروں، ٹینکوں اور توپوں سے۔ اگر اُس وقت تیر چلانا جزوِ اسلام تھا، تو آج ان بدلے ہوتے حالات میں ٹینکوں اور توپوں کا استعمال کیوں جزوِ اسلام نہ قرار پاتے۔ اسلام تمام کائنات اور تمام زمانوں کا مذہب ہے۔ اگر تیرہ سو سال پہلے حفاظت کے لیے گھوڑے۔ تلوار اور تیر کی ضرورت تھی۔ اور انھیں آنحضرتؐ نے ہماری تنظیم ملی کا جزوِ اعظم قرار دے دیا تھا، تو آج اسلام کو اپنی حفاظت کے لیے جدید آلات کی ضرورت ہے۔ انھیں کیوں جزوِ مذہب نہ سمجھا جاتے؟

سورۂ بقرہ کی پہلی آیت ہے:

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

یہ کتاب یعنی قرآن تمام شبہات سے بالاتر ہے اور متقین کیلیے باعث ہدایت ہے۔

"متقین"، کا مصدر ہے تقویٰ۔ جس کے ایک معنی ہیں۔ حفاظت، بچاؤ ڈیفنس۔ یعنی وہ لوگ بھی متقی ہیں، جن کا ڈیفنس مضبوط ہو۔ جن کی سرحدیں مستحکم ہوں، جو مہیب عسکری طاقت کے مالک ہوں۔ اور جن کا کردار اتنا بلند ہو، کہ ان پر کسی قسم کا حملہ نہ کیا جا سکے۔ اور آج تقویٰ کی یہ شان خوفناک اسلحۂ جنگ کے بغیر پیدا نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ اسلام اجتماعی تنظیم کا نام ہے۔ اور ملت کا ملکی دفاع ان آلات کے بغیر ناممکن ہے۔ اِس لیے ان آلات کی فراہمی و تخلیق منشائے ایزدی کے عین مطابق ہے۔

جُعِل رِزقی تحت ظِلّ رمحی (بخاری ج ۲ ص ۱۰۳)

میرا رزق (خدائی رحمت سے حصّہ) نیزے کے سائے میں ہے

بعثت بالسیف بین یدی الساعۃ۔

میں قیامت سے عین پہلے تلوار دے کر بھیجا گیا ہوں۔

جنگِ خندق کے دوران میں انصارِ مدینہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے؛

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِينَا أَبَدًا
(بخاری ج ۲ ص ۱۰۸)

ہم وہ ہیں جنھوں نے آنحضرت صلعم کے ہاتھ پر جہاد کے لیے بیعت کی ہم جب تک زندہ ہیں اعلائے خدا و رسول کے خلاف مسلسل مصروفِ پیکار رہیں گے۔

نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَۃِ شَہرٍ

(بخاری ج ۲ صہ۱۰۱)

مجھے اللہ نے وہ ہیبت دی ہے کہ میرا نام سن کر دشمن ایک مہینے کی مسافت پہ لرز جاتا ہے۔

أَعِدُّوْا لَھُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّۃٍ وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَ عَدُوَّکُمْ۔ (قرآن)

تم وہ قوت وہیبت پیدا کرو اور تمہارے تھانوں پہ گھوڑے اس ٹھاٹھ سے بندھے ہوں کہ اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن تمہارا نام سُن کر غش کھا جائیں۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست
یہ مذہبِ مُلّا و نباتات و جمادات

بارھواں باب

اللہ کی عادت

انگریزی کا ایک مقولہ ہے:
"کہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ہے" اور یہی مفہوم ہے اس آیت کا:

مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔

جو شخص ذرہ بھر نیکی کرے گا۔ اُس کا صلہ پائے گا اور ذرّہ بھر بُرائی کرے گا تو اُسکی سزا بھگتے گا۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مُكْتَسَبَتْ۔

اچھے کام کا صلہ اچھا اور بُرے کا نتیجہ بُرا ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُهَا۔

بُرائی کی سزا ایک ویسی ہی بُرائی ہے۔

اللہ کی یہ عادت ازل سے ایک نہج پہ کام کر رہی ہے۔ ہر ایک اپنی نیکی کا صلہ پا رہا ہے۔ اور ہر بد کن اپنے کرتوتوں کی سزا بھگت رہا ہے۔ صبح کی سیر اور شام کی ورزش کی جزا ایک عمدہ صحت ہے جو ہر انسان کو بلا امتیازِ مذہب و ملّت ملتی رہی۔ سستی اور کام چوری کی

سزا ایک ذلیل زندگی ہے۔ جس سے آج تک نہ کوئی مسلم بچ سکا اور نہ غیر مسلم۔ ہر انسان انتخاب اعمال میں آزاد ہے۔ لیکن ان کے نتائج بھگتنے پر مجبور ہے۔ جب تک مسلمان منظم۔ متحد اور بلند کردار کے جوہر سے متصف رہے، وہ دنیا پہ حکومت کرتے رہے۔ اور جب ان عالی اوصاف سے بیگانہ ہو گئے، تو اللہ نے انھیں ذلیل کر کے گداگروں سے بھی بدتر کر دیا۔ آج مسلمانوں کی تعداد ساٹھ کروڑ سے کم نہیں۔ ان کی آٹھ نو ٹوٹی پھوٹی سلطنتیں بھی موجود ہیں۔ لیکن ذرا نگاہ عبرت سے دیکھیے کہ ان کی حالت کیا ہے۔ اوّل درجے کے جاہل۔ غیر منظم۔ بدمعاشرت۔ نہ کھانے کی تمیز، نہ بات کرنے کا ڈھنگ۔ نہ قبائح سے نفرت، نہ محاسن کا شوق۔ بچھ کروڑ روسیوں کو دیکھو۔ ڈھوروں سے بدتر۔ ایک کروڑ قبائلیوں کی یہ حالت کہ جہالت میں چوٹی تک ڈوبے ہوتے ہیں۔ اور صابن کے نام تک سے نا آشنا۔ چالیس لاکھ کشمیریوں اور پانچ کروڑ چینی مسلمانوں کی حالت ان سے بھی بدتر۔ مسلمان ہر آب و ہوا اور ہر ملک میں ملتے ہیں۔ لیکن ہر جگہ چند چیزیں ان میں مشترک ہیں۔ یعنی جہالت۔ غلاظت پستی۔ افلاس۔ کام چوری۔ کاہلی اور اپنی قوم سے غدّاری۔ دنیا کی کسی قوم نے آج تک اتنے غدّار پیدا نہیں کیے۔ جتنے اسلام صرف ایک صدی میں پیدا کر چکا ہے۔ ہندوؤں۔ سکھوں۔ اور عیسائیوں میں بھی غریب ہوں گے جنھیں خریدا جا سکتا ہے لیکن پینتیس کروڑ ہندوؤں میں ایک بھی غدار موجود نہیں۔ یہی حال عیسائیوں

اور سکھوں کا ہے۔ اور مسلمان، توبہ ہی بھلی۔ اس وقت پاکستان میں ہزار ہا مسلمان پاکستان کی تباہی کے لیے مصروفِ کار ہیں۔ کوئی مخبر رسانی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ کوئی ہمارے لیڈروں کو کوس کوس کر ہماری صفوں میں انتشار پیدا کر رہا ہے۔ اور کوئی چور بازاری سے مصنوعی قحط پیدا کر رہا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اس بری حالت کا ذمّہ دار کون ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ مُلّا اور اس کا "اسلام"۔ دُنیائے اسلام میں لاکھوں مساجد۔ ان میں لاکھوں مُلّا۔ اور ہر مُلّا صبح و شام مسلمانوں کو مندرجہ ذیل اسباق دے رہا ہے:

(۱) کہ صرف تم اللہ کے محبوب ہو۔ یہ اُمّت بخشی بخشائی ہے۔ اور اللہ تمہیں کبھی عذاب نہیں دے گا۔

(۲) کہ الدنیا جیفۃ و طلابہا کلاب۔ یہ دنیا ایک مردار ہے جس کے طالب کتّے ہیں۔

(۳) کہ المومن لا ینجس۔ مومن جسم پہ کتنی ہی غلاظت مل لے وہ ناپاک نہیں ہوتا۔

(۴) کہ صرف کلمہ پڑھنے سے بہشت مل جاتی ہے۔

(۵) کہ فقہ و حدیث کے بغیر باقی تمام علوم ناپاک ہیں۔ سائنس گناہ اور کائنات میں غور کرنا کفر ہے۔

(۶) کہ دنیا کا سب سے بڑا عمل رات کے وقت دو نفل ہیں رکعتین

فی جوف اللیل خیر من الدنیا وما فیہا (رات کے وقت دو نفل دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں)

(۷) کہ ہر نتھو خیرا، خواہ وہ چنگیز ہو یا ہٹلر۔ اگر ہم پہ حکومت کر رہا ہے۔ تو وہ ہمارا اولی الامر ہے۔ اور اس کی اطاعت ہم پہ فرض ہے۔ یاد کیجیے، ان فتاوے کو جو ہمارے علما انگریز کے زمانے میں جاری کیا کرتے تھے۔

(۸) کہ خرقہ دنیا کا بہترین لباس ہے۔ علیکم بلباس الصوف تجد وحلاوۃ الایمان (حدیث) (کہ تم پشم کا لباس پہنا کرو کہ ایمان کی لذت اسی میں ہے)

(۹) کہ فلاں دعا ایک لاکھ حج اور لاکھ شہیدوں کا ثواب دلاتی ہے۔ اور جنت میں ایک لاکھ محل مفت بنوا دیتی ہے۔

(۱۰) کہ مرشد پکڑے بغیر نجات ناممکن ہے۔

(۱۱) کہ اللہ نے تمام اختیارات فلاں مرشد کے حوالے کر دیے ہیں۔ اس لیے اس سے مرادیں مانگا کرو۔ وغیرہ وغیرہ

انصافاً کہو۔ کہ اگر کسی آدمی کے دماغ میں اس قسم کے عقائد ٹھونس دیتے جائیں۔ کہ یہ دنیا مردار ہے۔ سائنس گناہ ہے۔ سب سے اچھا لباس گدڑی ہے۔ بہشت ہمارے پاس رہن ہو چکی ہے۔ اللہ صرف ہمارا ہے۔ تو وہ کیوں کام کرے۔ اور کس مقصد کے لیے؟ دنیا اس کے لیے ناپاک۔ جنت اس کی۔ خدا اس کا۔ باقی رہ کیا گیا۔ تنظیم کی کیا

ضرورت ہے؟ جہاد کیوں کیا جائے؟ جہاد میں زیادہ سے زیادہ ایک شہید کا اجر ملتا ہے۔ اور فلاں دعا کے ورد سے ایک لاکھ کا اجر۔ لاکھ کو چھوڑ کر ایک کے پیچھے کون جائے؟ علم کیوں حاصل کیا جائے؟ پندرہ سولہ برس کون دماغ کھپائے؟ خصوصاً ایسے حالات میں کہ حصول علم صحیح حدیث کی رو سے کسی اجر کا مستحق ہی نہیں۔

مُلّا تیرہ سو برس سے ان عقائد کی تبلیغ کر رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوہام و اباطیل ملّت کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے۔ ہر فرد دعاگو اور دعاخوان بن کر دنیائے عمل سے کوسوں دُور جا پڑا۔ نہ بلندیوں کا شوق، نہ معالی سے عشق، نہ محنت سے لگاؤ، نہ عمل سے تعلق، نہ لہو میں حرارت، نہ سینوں میں تڑپ، پاؤں ذوقِ رفتار سے بیگانہ اور ہاتھ لذّتِ کار سے محروم ہے

عشق میں ہیں، سکتہ میں ہیں، یا مبتلائے خواب ہیں
یا نصیبِ دشمناں یہ موت کے اسباب ہیں

ہر مرض، ہر اُفتاد اور ہر حادثہ کا علاج دعا سے کیا جاتا رہا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں اتحادیوں نے مار مار کر ٹرکی کا بلستر بگاڑ دیا۔ اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ربنا فانصرنا علی القوم الکافرین کی لمبی لمبی دعائیں مانگتے رہے۔ انھیں کون سمجھائے کہ دنیا دار العمل ہے۔ یہاں صرف عمل سے بیڑے پار ہوتے ہیں۔ سارا قرآن محنت۔ صبر۔ ابتلاء۔ جاں سپاری اور جہاد کی طرف بلا رہا ہے۔ اور

قدم قدم پر یہ دھمکی دے رہا ہے۔ کہ

فَإِنْ تَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ	اگر تم نے عمل چھوڑ دیا۔ تو ہم کسی اور قوم کو تمہارا وارث بنا دیں گے۔
وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔	ہمارے راستے کو چھوڑنے والا کوئی ہو۔ ہم اُسے مٹا دیں گے۔ اس لیے کہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔
(قرآن)	

لیکن ہم ہیں کہ مفت جنّت کے نشہ میں چُور کسی کی سُنتے ہی نہیں۔ غور کرو کہ دنیا میں ہماری کیسی کیسی سلطنتیں قائم ہوتی تھیں۔ وہ اُمیہ جو سندھ کے ریگستانوں سے فرانس تک چھائے ہوئے تھے۔ وہ عباسیہ جن کی ہیبت سے ایک عالم لرزتا تھا۔ وہ ہسپانوی سلسلے جنھوں نے تمام یورپ میں تہلکہ ڈال رکھا تھا۔ وہ سلاجقہ جن کی شمشیرِ خارا شگاف سے ایک دنیا دہلتی تھی۔ وہ تیموری جن کی بجلیاں دہلی پہ تڑپتی تو قسطنطنیہ پہ جا گرتی تھیں۔ وہ ایوّبی جن کا نام سُن کر دُولِ مغرب غش کھا جاتی تھیں، اور اسی طرح کے ایک سو تئیس اور سلسلے۔ جب یہ سب عیّاش بن گئے۔ کام چھوڑ دیا۔ محنت سے کترانے لگے۔ ایثار سے بھاگنے لگے تنظیم سے دست کش ہو گئے، تو اللہ نے ان کی داستانِ عظمت و حشمت افسانہ بنا کر رکھ دی۔ اور انھیں تاریخ کے قبرستان میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ اللہ نے ہرگز پروا نہ کی۔ کہ یہ لوگ پیرو رسول ہونے کے مدّعی تھے۔ نفل پڑھتے تھے۔ دعاؤں کا ورد کرتے تھے قضا و قدر

کے قائل تھے۔ اور بڑے ادب سے کلمہ شریف پڑھا کرتے تھے۔

اللہ کی یہ وہ سنّت ہے، جو ازل سے اس کائنات میں محوِ عمل ہے۔ اور جو کسی قوم، کسی عقیدے، یا کسی دعا کی وجہ سے نہ آج تک بدلی اور نہ آیندہ بدل سکتی ہے۔

سُنَّۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔

(قرآن)

یہ اللہ کی وہ عادت ہے۔ جو اِس دارالعمل میں ازل سے کام کر رہی ہے اور ہم اس عادت کو کبھی صورت میں بھی بدلنے کے لیے تیار نہیں۔

اللہ نے قرآن میں ۵۶، مرتبہ کہا تھا۔ کہ کائنات کو مسخّر کرو۔ زمین کا سینہ چیر کر اس سے قوت و ہیبت کے خزائن نکالو۔ عناصر کی سرکش قوتوں کو اپنی خدمت پہ لگاؤ۔ ہواؤں پہ حکمرانی کرو۔ سمندروں کی مہیب موجوں کی سینہ زوریاں توڑو۔ آفتاب و ماہتاب کی شعاعوں کو گرفتار کرو۔ اور علم کے پر لگا کر فضاؤں میں اس شان سے پرواز کرو۔ کہ تمام کائنات لرزہ بر اندام ہو جائے۔ لیکن ہم مساجد کے تاریک گوشوں میں گھس کر ہن ہن کرنے لگے ؎

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب پر

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

(اقبالؔ)

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم کی سیاسی و اجتماعی ہیئت مسخ ہو کر رہ گئی۔ اور دنیا ہماری متعفن لاش کی بدبو سے چیخ اُٹھی۔ اور

یہ نتیجہ تھا وضعی حدیث کے اُس غیر فطری اسلام کا جو صدیوں سے مُلّا ہمارے سامنے پیش کر رہا تھا۔

دنیا میں ہر عمل کا ایک صلہ ہے۔ جو کسی صورت میں اس سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ ایک زانی اپنے جرم کی سزا سے محض اس لیے نہیں بچ سکتا کہ وہ کلمہ پڑھا کرتا ہے۔ کلمہ ہے کیا؟ خدا کے ایک ہونے اور محمد صلعم کے رسول ہونے کا اعتراف۔ کیا یہ زبانی اعتراف اتنی بڑی چیز ہے کہ اس سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی شخص خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل اور کسی ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو اُن کا نمائندہ تسلیم کرنے کے بعد ہر جرم کا بلا خوفِ سزا مرتکب ہو سکتا ہے؟ کیا حاکم کو حاکم سمجھنا اور اس کے احکام کو توڑنا ایک مکروہ قسم کی منافقت اور عیّاری نہیں؟ کیا اس قسم کی عیّاری کسی سزا کی مستحق نہیں؟

فرض کیجیے کہ آپ کسی سکول، کالج یا دفتر کے افسر اعلیٰ ہیں۔ آپ کا ایک ملازم ہر صبح بڑے ادب سے جھک کر آپ کو سلام کرتا ہے۔ آپ کو واجب التعمیل حاکم سمجھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی آپ کے ہر حکم کو توڑتا بھی ہے۔ کیا آپ اس شخص کو محض اس لیے معاف کرتے جائیں گے کہ وہ زبانی زبانی آپ کو اپنا افسر سمجھتا ہے؟ اگر انسان اس منافقت اور عیّاری کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، تو خدا کیوں کرے؟ لیکن حدیث کچھ اور کہتی ہے۔ مثلاً

"حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں۔ کہ میں رسول اللہ صلعم کے،

ہمراہ ایک ہی سواری پہ سوار تھا ...... آپ نے فرمایا کہ جو شخص مُنہ سے لآ اِلٰہ اِلاَّ اللہ کہے گا، اُس پہ جہنّم حرام کر دیا جائے گا۔ معاذ نے پوچھا۔ کیا میں سب کو یہ ارشاد سُنا دوں؟ فرمایا: کہ لوگ اس پر اعتماد کر کے سست ہو جائیں گے۔ چنانچہ معاذ نے مرتے وقت یہ حدیث ظاہر کی"۔
(مسلم ج ۱ صہ ۲۰۵)

حضرت معاذ نے تو مرتے وقت یہ حدیث ظاہر کی، اور اس لیے اُس زمانہ کے لوگ اُس سستی اور کاہلی سے بچ گئے۔ جس کا خطرہ حضورؐ نے ظاہر فرمایا تھا۔ لیکن اب ہم کیا کریں۔ یہ حدیث گذشتہ ساڑھے تیرہ سو برس سے ہمارے سامنے ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو کاہل بنا چکی ہے اور قیامت تک بناتی جائے گی۔ کیا ہمارے علما اس مرض کا کوئی علاج سوچیں گے؟

بعض علما یہ کہتے ہیں۔ کہ کلمہ اسلام کا دروازہ ہے۔ جو شخص اس دروازے میں داخل ہو گا۔ یا یوں کہیے کہ اسلامی سوسائٹی کا ممبر بن جائے گا۔ اُسے لازماً اسلامی کردار اختیار کرنا پڑے گا۔ اِس لیے کلمہ پڑھنے سے مطلب تمام اسلامی کردار اختیار کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص جہنم میں نہیں جائے گا۔ تاویل تو اچھی ہے۔ اور کافی وزن رکھتی ہے لیکن یہ فرمائیے کہ رسول اللہ صلعم نے حضرت معاذؓ کو اس حدیث کی تبلیغ سے کیوں روک دیا تھا۔ اگر کلمہ پڑھنے کا مطلب اسلامی کردار اختیار

کرنا تھا، تو پھر اس حدیث کی روایت سے روکنے کا مطلب ؟ کیا اسلامی کردار سستی پیدا کرتا ہے ! ہرگز نہیں، تو پھر حضورؐ نے اس حدیث کے اظہار سے کیوں روکا ؟ اس لیے ہم لازماً اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم رسالت والوہیت کا زبانی اقرار تھا۔ اور چونکہ زبانی اقرار کی اتنی بڑی جزا قوم کو بے عمل بنا سکتی تھی۔ اس لیے آپ نے اس حدیث کو بیان کرنے سے روک دیا تھا۔

ہمارے اس استدلال کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے :۔

ایک مرتبہ حضورؐ کسی باغ میں تشریف فرما تھے کہ آپ کے پاس ابوہریرہؓ جا پہنچے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ جو شخص ملے اُسے یہ بشارت دے دو کہ کلمہ پڑھنے والا داخل جنّت ہوگا۔ ابوہریرہؓ وہاں سے باہر آئے، تو سب سے پہلے حضرت عمر بن الخطاب سے دوچار ہوئے اور انھیں وہ بشارت سُنائی۔ حضرت عمرؓ نے ابوہریرہؓ کی چھاتی میں ایک گھونسہ رسید کیا۔ ابوہریرہؓ بھاگ کر حضورؐ کے پاس پہنچے۔ عمرؓ بھی پیچھے تھے۔ ابوہریرہؓ تکلیف کی وجہ سے رونے کو تھے۔ حضورؐ نے واقعہ پوچھا۔ اور پھر عمرؓ سے دریافت کیا کہ اسے کیوں پیٹا ہے ؟ کہا، کیا آپ نے کلمہ پڑھنے پہ جنت کی بشارت دی ہے ؟ فرمایا : ہاں۔ کہا۔ آپ ایسا نہ کریں۔

مبادا کہ لوگ سُست ہو جائیں۔ انھیں کام کرنے دیجئے۔
فرمایا بہت اچھا۔ ہم لوگوں کو کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں"!
(ملخص کتاب الایمان۔ ج ۱ صفحہ ۲۰۲)

اگر کلمہ پڑھنے سے مراد اسلامی کردار پیدا کرنا ہوتا، تو حضرت عمرؓ حضرت ابو ہریرہؓ کو کیوں پیٹتے اور حضورؐ سے یہ کیوں کہتے:" کہ آپ لوگوں کو سست نہ بنائیں اور انھیں کام کرنے دیں"۔

عجیب حدیث ہے۔ کہ جو رسولؐ تیئیس برس تک اصلاح اخلاق کے لیے بے اندازہ مصائب برداشت کرتے رہے۔ جو اپنے اصحاب کو کم و بیش تیئیس جنگوں میں خود لے گئے یا بھیجا۔ جنھوں نے سب کچھ اللہ کے راستے میں قربان کیا۔ اُنہی کی زبانی ہمیں یہ بھی سُنایا جاتا ہے۔ کہ کلمہ پڑھنے والا جنتی ہے۔ اگر جنت اتنی آسان تھی، تو صحابہ کو اتنی ابتلاؤں میں کیوں ڈالا۔ اُن سے جان و مال کی قربانی کیوں طلب کی۔ اُن سے روزے کیوں رکھوائے۔ حج کیوں کرائے۔ زکواۃ کیوں فرض کی۔ ہر گناہ سے بچنے کی کیوں ہدایت کی ساڑھے چھ ہزار آیات کی کیا ضرورت تھی؟ صرف ایک آیت کافی تھی۔ من قال لا الٰہ الّا اللّٰہ دخل الجنۃ۔ اگر ان احادیث کو پڑھنے کے بعد بھی آپ کی یہی رائے ہو کہ کلمہ سے مراد مکمل اسلامی کردار ہے، تو ذرا اس حدیث پہ بھی غور کیجیے۔ یہ حدیث مسلم اور بخاری ہر دو میں دی ہوئی ہے۔ راوی ایک ہی ہے لیکن الفاظ میں تھوڑا سا

اختلاف ہے۔

"حضرت ابو ذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آنحضرتؐ کے پاس گیا۔ آپ نے فرمایا: ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علیٰ ذالک الا دخل الجنۃ (جب کوئی آدمی "لا الٰہ الا اللہ" کہتا ہے اور اس کی موت اسی عقیدے پہ ہو جاتی ہے، تو وہ جنّت میں چلا جاتا ہے) میں نے پوچھا کہ اگر وہ زانی اور چور ہو تو پھر؟ فرمایا پھر بھی جنت میں جائے گا۔ میں نے تین مرتبہ یہی سوال پوچھا، اور آپ نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا۔ اور چوتھی مرتبہ کہنے لگے علیٰ رغم انف ابی ذر[1] کہ جنت ہی میں جائے گا۔ خواہ ابو ذر کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔"

(مسلم ج ۱ ص ۲۵۸)

خلاصہ یہ کہ کلمہ پڑھتا جائے اور زنا اور سرقہ کے مزے بھی لوٹتا جائے سیدھا جنّت میں جا پہنچے گا۔ کیا اسلامی کردار یہی ہے؟

ایک طرف تو حدیث میں لکھا ہوا ہے:

(۱) لا یدخل الجنّۃ قتات۔ غمّاز بہشت میں نہیں جائے گا

(مسلم ج ۱ ص ۲۶۳)

---

[1] اس کے لفظی معنی ہیں خواہ ابو ذر کی ناک مٹی سے لتھڑ کیوں نہ جائے۔ مطلب یہ ہوا ہے کہ کتنی ہی دماغی کوفت کیوں نہ ہو۔ کلمہ خواں بہشت میں جائے گا

(مصنف)

(۲) "تین آدمیوں سے اللہ قیامت کے دن نہ گفتگو کرے گا۔ نہ انھیں دیکھے گا۔ اور نہ گناہ معاف کرے گا۔ بلکہ انھیں سخت عذاب دے گا۔ اوّل غرور سے دامن گھسیٹ کر چلنے والا۔ دوم احسان کر کے جتانے والا سوم جھوٹی قسمیں کھا کر سودا بیچنے والا"

(مسلم ج ۱ ص ۲۶۴)

(۳) من اقتطع حق امرئ مسلم بیمینہ۔ فقد اوجب اللہ لہ النار۔ وحرّم علیہ الجنۃ فقال لہ رجل وان کان شیئا یسیرا قال وان کان قضیبا من اراک

جو شخص قسم کھا کر مسلمان کا حق مار لے اس پر جنت حرام کر دی جاتی ہے ایک شخص نے پوچھا اگر وہ حق بہت تھوڑا ہو؟ فرمایا خواہ پیلو کی ایک شاخ ہو۔

(مسلم ج ۱ ص ۲۸۲)

(۴) لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن۔ ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن

زانی زنا کے وقت اور چور چوری کے وقت مومن نہیں رہتا

لیکن دوسری طرف ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اگر چور اور زانی کلمہ پڑھتے رہیں تو یقینا وہ بہشت میں جائیں گے۔

اس طرح کی احادیث وضع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اور قرآن کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی جاتے۔ اُسے نا اہل۔ بیکار۔ اور نکما بنا دیا جاتے۔ اور ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دشمن کی یہ چال

نہایت کامیاب رہی جن حیلہ سازوں نے یہ احادیث تراشی تھیں وہ تو جہنم رسید ہو گیا۔ لیکن اس کے ہاتھوں ابھی تک زندہ ہیں جو تمام تر ان احادیث کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنے وعظوں اور خطبوں میں بلا ناغہ بیان کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ کہیں یہ غیر قرآن کے آئینہ میں اپنی اصلی صورت نہ دیکھ لے اور ملّا کے اس افسردہ و فرسودہ اسلام سے بھاگ نہ نکلے۔

ارمغان حجاز میں علامہ اقبالؒ شیطان اور اس کے مشیروں کی ایک مجلس قائم کرتے ہیں۔ جس میں بڑا شیطان چھوٹوں سے کہتا ہے کہ خبردار مسلمان کو جاگنے نہ دینا۔

تم اسے علم کلام کی مباحث۔ خلق قرآن۔ حیات مسیح۔
اور الٰہیات کے مسائل میں الجھائے رکھو اور

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے — تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

اس طرح کے تمام داؤں وضعی احادیث میں موجود ہیں۔ بڑے ملّا نے کہا کہ حدیث وحی ہے۔ چھوٹے نے کہا۔ آمنّا و صدقنا۔ اور وہ حدیثی اسلام کی تبلیغ میں نکل پڑا۔ کوئی آڑے آیا۔ تو شور مچا دیا۔ کہ

پکڑ دھکڑ۔ بھاگ نہ جائے۔ یہ قرآنیہ ہے۔ یہ اہل قرآن ہے۔ یعنی قرآن سے نسبت رکھنا بھی جرم ہے۔ اس قسم کے طریقے اختیار کر کے ملّا خانہ ساز اسلام پھیلاتا رہا۔ اور اب یہ حالت ہو چکی ہے۔ کہ قرآنی اسلام کا نام تک لینا گناہ ہے۔ ساری اُمت دعائیں پڑھ پڑھ کر گناہ بخشوا رہی ہے۔ باتوں سے جنت خرید رہی ہے۔ گھر بیٹھے لاکھ لاکھ حج کر رہی ہے۔ تلوار چلائے بغیر لاکھوں شہیدوں کا اجر سمیٹ رہی ہے۔ جبرئیل پیٹ رہا ہے۔ کہ او ظالمو! یہ کان کٹا، اور مسخ شدہ اسلام کہاں سے لاتے ہو۔ مجھے تو خدا نے نہیں دیا تھا۔ اور قرآن چیخ رہا ہے۔ کہ او دلچسپ انسانو! تم چومتے مجھے ہو۔ تلاوت میری کرتے ہو۔ قسم میری کھاتے ہو، اور عمل کرتے ہو ایسی حدیثوں پر جو میری تعلیم کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکیں۔ لیکن سنتا کون ہے۔ سچ کہا تھا، علامہ اقبال رحمۃ نے۔ کہ مسلمان کو چار موتوں نے گھیر رکھا ہے:

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر
سود خوار و والی و ملّا و پیر

لے مت سمجھیے کہ میں کسی ایسے گروہ سے تعلق رکھتا ہوں، جو اہل قرآن کہلاتا ہے میں نہ ان کے عقائد سے آگاہ ہوں، نہ ان کے کسی فرد سے کبھی ملا ہوں۔ اور نہ میں فرقہ پرستی اور گروہ بندی کا تصوّر تک بھی برداشت کر سکتا ہوں۔ (برق)

لے ملّا سے مراد متعصب، تنگ نظر، کم علم اور کوتہ اندیش واعظ و امام مسجد ہے نہ کہ صحیح النظر عالم۔ (برق)

مہاجن اور انگریز سے تو جان چھوٹی۔ اب صرف دو باقی ہیں۔ مُلّا اور پیر۔ مسلمانانِ پاکستان کی فراست ترقی پر ہے۔ اور کوئی عجب نہیں کہ کچھ عرصے کے بعد ان دو بیماریوں سے بھی جان چھوٹ جائے ؎

تیرہواں باب

لفظ "مغفرت" کی تحقیق

مغفرت کا ماخذ "غفر" ہے۔ جس کے معنی ہیں چھپانا، اور ڈھانکنا۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ہوتا ہے۔ جو اس سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کوئی گناہ معاف نہیں ہو سکتا۔ البتہ چھپ سکتا ہے۔ چند مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔

(۱) سینکڑوں ایسے صحابہ ہو گذرے ہیں۔ جنھوں نے آغاز میں حضورؐ کی مخالفت کی۔ تکلیفیں دیں۔ اور آپ پر چڑھائی کی۔ لیکن بعد میں حلقہ بگوش اسلام بن گئے۔ اور ان کے پچھلے گناہ اس نئے عمل کے پیچھے چھپ گئے۔

(۲) آپ کو یاد ہو گا۔ کہ قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ مدتوں کانگرس کے حلقہ بگوش رہے۔ لیکن بعد میں وہ مسلمانانِ ہند کی واحد جماعت لیگ میں شامل ہو گئے۔ اور ان کی پچھلی غلطیاں قوم نے بھلا دیں۔

ان سے بھی زیادہ واضح امثلہ یہ ہیں:

(۳) فرض کیجیے کہ ایک نوجوان کسی عادتِ بد میں مبتلا ہو کر صحت کا جنازہ

نکال لیتا ہے اور دِق کے قریب جا پہنچتا ہے۔ پھر دفعتہ سنبھل جاتا ہے۔ بد عادات کو ترک کر دیتا ہے۔ اصول صحت پہ عمل کرنے لگ جاتا ہے۔ ہر صبح سیر کو جاتا ہے۔ شام کو ورزش کرتا ہے۔ صاف غذا کھاتا ہے اور صاف ہوا میں رہتا ہے۔ اس کی صحت ترقی کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک تنومند اور صحیح الجسم نوجوان بن جاتا ہے۔ اس نے گویا تلافیٔ مافات کر لی۔ اور اس کے پچھلے گناہ چھپ گئے اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ پچھلا گناہ معاف ہو گیا ہے۔ اس نے ایک گناہ کیا۔ اور اس کی باقاعدہ سزا بھگتی۔ برسوں کمزور رہا اور بڑی مدت کا شکار رہا۔ عام نفرت کا نشانہ بنا اور کئی راتیں فکر، درد، اور قبض کی وجہ سے بیداری میں کاٹیں۔ یہی اس گناہ کی سزا تھی، جو وہ بھگت چکا۔ اب اسے نیک اعمال کا صلہ مل رہا ہے یعنی گناہوں کی سزا عارضی اور وقتی ہوا کرتی ہے۔ مثلاً آپ نے بھڑ کو چھیڑا اور اس نے ڈنک لگا دیا۔ زہر کا اثر ایک دو دن کے بعد ختم ہو جائے گا۔ آپ نے موٹر پر سائیکل کی رفتار تیز کر دی۔ سامنے بجلی کے کھمبے سے ٹکرا گئے۔ سائیکل ٹیڑھی ہو گئی اور آپ کے گھٹنے زخمی۔ دو چار روپے سے سائیکل ٹھیک ہو جائے گی۔ اور دو چار دن تک گھٹنے دُکھ دیتے رہیں گے۔ یہی اس جرم کی سزا تھی۔ اگر اس واقعہ کے بعد آپ موٹر پہ سائیکل آہستہ چلانا شروع کر دیں۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ پچھلا گناہ معاف ہو جائے گا۔ گناہ ہو چکا۔ اور اس کی سزا مل چکی۔ یہ ایسے گناہ

ہیں۔ جن کی سزا کی میعاد بقدر گناہ ہوا کرتی ہے۔ لیکن بعض گناہ ایسے بھی ہیں، جن کی سزا مدّت تک سہنا پڑتی ہے۔ مثلاً ایک شخص بچپن میں علم حاصل نہیں کرتا۔ اس کی یہ جہالت اسے عمر بھر ذلیل و محتاج رکھے گی۔ ایک کاہل کسان سال بھر بھوکا مرے گا۔ اور ایک گستاخ ملازم دیروزہ و رزق کے اس وسیلے کو کھو بیٹھے گا۔

(۴) ایک طالب العلم سال بھر آوارہ گردی کرتا ہے اور سالانہ امتحان میں فیل ہو جاتا ہے۔ اگلے سال وہ محنت کرکے یونیورسٹی میں اوّل رہتا ہے۔ پہلے سال وہ اقران و اماثل میں ذلیل ہوا۔ اساتذہ نے اُس پر پھٹکار اور والدین نے لعنت بھیجی۔ لیکن اگلے سال کی کامیابی نے اُس کی پچھلی ناکامی کو چھُپا لیا۔ میں ایک ایسے طالب العلم سے واقف ہوں، جس نے بی۔ اے میں درجہ سوم حاصل کیا تھا۔ اور ہر وقت پیٹتا رہتا تھا۔ کہ میرا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔ اُسی لڑکے نے ایم۔ اے میں درجہ اوّل حاصل کرکے پچھلی کمزوری کو چھُپا لیا۔ تو گویا اُس کی پچھلی کوتاہیاں ڈھک گئیں۔ اور اسی کا نام "مغفرت" ہے۔

مغفرت کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ اوّل اس گناہ سے بچنا۔ دوم تلافیٔ مافات کے لیے صحیح اور فطری کوشش۔ خرابیٔ صحت کے لیے فطری کوشش۔ عاداتِ بد سے اجتناب اور ورزش وغیرہ ہے۔ نہ کہ ڈھول بجانا، یا سُر سے پیر انجھا پڑھنا۔ امتحان میں کامیابی کا علاج کتب نصاب کو پڑھنا اور مضامین کو یاد کرنا ہے۔ نہ کہ باہر جاکر گڑھے کھودنا لیکن

بعض احادیث ایسی موجود ہیں، جو تلافیٔ مافات کے لیے نہایت غیر فطری اور مضحکہ خیز تدابیر پیش کرتی ہیں۔ مثلاً

"حضرت عثمانؓ نے چند آدمیوں کو وضو کا طریقہ بتا کر کہا، کہ رسول اللہ صلعم اسی طرح وضو کیا کرتے تھے۔ جو شخص اس طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے۔ اُس کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں"۔

(ملخص بخاری ج ۱ صہ۲۹)

مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص باپ کو قتل کرنے کے بعد وضو کر کے دو رکعت پڑھ لے، تو گناہ معاف۔ یا کوئی طالب العلم سال بھر کام نہ کرے اور آخر میں دو رکعت نماز پڑھ لے سستی کا گناہ معاف۔ اور وہ پاس۔ یا کوئی شخص درخت سے کود کر ٹانگ تڑوا لے اور فوراً دو رکعت نقل پڑھ لے، تو گناہ معاف اور ٹانگیں والپس۔

اس قسم کی احادیث گھڑنے والے یا تو ایسے کم سواد مسلمان تھے جو نہ اللہ کی عادت سے واقف تھے، نہ مغفرت کے معانی سے آگاہ اور نہ تلافی مافات کے فطری تخیل سے آشنا تھے۔ جو مُنہ میں آیا کہہ دیا اور اسے حضور پرنور کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیا۔ اور یا ایسے اعدائے اسلام جن کا مقصد ہی حضورؐ کے علم کی توہین تھا۔

(۲) "جب نماز میں امام ولا الضالین کہے اور مقتدی آمین کہیں۔ اور ان کی "آمین" کا وقت فرشتوں کی "آمین" کے وقت

سے مِل جائے۔ یعنی سب ہمنوا ہو جائیں، تو ان کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں" (بخاری کتاب الصلوٰۃ)

مسلم، بخاری، اور دیگر کتبِ احادیث میں اس قسم کی سینکڑوں روایات ہیں۔ جہاں چند دعاؤں کے وِرد کرنے پر ساری زندگی کے گناہ معاف کیے جا رہے ہیں۔ فطرت لاکھ پکارے کہ آ۔ میرا مطالعہ کر اور میرے قوانین کو سمجھ۔ تجربہ و مشاہدہ ہزار کہیں، کہ اس قسم کی مغفرت خلافِ قیاس۔ خلافِ عقل اور خلافِ مشاہدہ ہے۔ قرآن لاکھ اعلان کرے کہ ہم ہر عمل کی جزا دیا کرتے ہیں۔ اور ہم اپنی عادت قطعاً بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن مُلّا، دنیا سے یہی کہے جائے گا، کہ صرف حدیث سچی ہے، اور باقی سب کچھ غلط۔ عقل نا قابلِ اعتبار۔ مشاہدہ فریبِ نگاہ۔ اور قرآن ایک مجمل سی کتاب ہے۔ جسے حدیث کی مدد کے بغیر سمجھنا ٹھیک نہیں۔

(۳۶) "جب کوئی شخص وضو میں مُنہ دھوتا ہے، تو اُس کی آنکھوں کے سب گناہ (بیگانہ عورت کو دیکھنا وغیرہ) معاف ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ دھونے سے ہاتھوں کے اور پاؤں دھونے سے پاؤں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔"

(ملخص مسلم ج ۱ ص ۴۰۹)

ہے کوئی ایسا گناہ جس میں ہاتھ پاؤں اور آنکھ کی مدد شامل نہ ہو؟ زنا۔ چوری۔ ڈاکہ۔ شراب نوشی۔ جُوا۔ قتل سب کے سب انہی اعضا کی

مدد سے سرزد ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ وضو کیا اور دست و رد کے غبار کی طرح سب گناہ ڈھل کر بدررو میں بہہ گئے۔ صرف ایک بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کہ جب وضو سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو حضورؐ اور حضورؐ کے خلفا نے مسلمانوں پہ زنا، سرقہ اور شراب نوشی کی حدود کیوں جاری کی تھیں؟ جب وضو کے بعد کوئی گناہ رہتا ہی نہیں تو پھر سزا دینے کا مطلب؟

گناہوں کا کتنا عجیب علاج بتایا گیا ہے کہ قتل کرو، تو ہاتھ دھو لو اور قتل معاف۔ اب خیر سے ہمارے علما چلا رہے ہیں کہ پاکستان میں شریعت نافذ کرو اور ان کے ہاں شریعت حدیث کا نام ہے یا فقہ کا۔ اگر اس طرح کی شریعت جاری ہو گئی، تو پہلے دن قیامت آ جائے گی۔ اس لیے کہ ہر مجرم قتل و زنا وغیرہ کے بعد ہاتھ پاؤں دھو لے گا، اور سزا سے بچ جائے گا۔ اس حدیث کی رُو سے عدالت تو صرف اتنا دریافت کر سکتی ہے۔ کہ اے زانی اور خونی! کیا قتل و زنا کے بعد تم نے وضو کر لیا تھا؟ اگر کر لیا تھا، تو جاؤ عیش اُڑاؤ۔ اور پولیس کو ہدایات نافذ ہو نگی کہ دنیا کے ہر مسلمان کو ہر وقت نظر میں رکھو۔ جوں ہی وہ گناہ کرے اُسے فوراً گرفتار کر لو، اور وضو نہ کرنے دو۔ ورنہ یہ شخص فرشتوں کی طرح معصوم اور حوروں کی طرح پاک دامن بن جائے گا، اور ہم اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

چودھواں باب

مسئلۂ شفاعت

قرآن حکیم کے طول و عرض میں کہیں بھی مذکور نہیں کہ آنحضرت صلعم محشر میں شفاعت کریں گے۔ البتہ دنیا میں استغفار کا ذکر ضرور ہے۔

"اگر یہ لوگ مغفرت طلب کریں۔ اور رسولؐ بھی ان کے لیے مغفرت مانگے۔ تو پھر یہ اللہ کو توّاب و رحیم پائینگے"۔
(قرآن)

مطلب یہ کہ جو لوگ تلافیٔ ما فات کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ اور حضور ان کی رہبری فرمائیں تو اُن کے پچھلے گناہ چھپ جائیں گے۔ اس مضمون کے علاوہ شفاعتِ حضورؐ کا کوئی اور تخیّل قرآن میں موجود نہیں۔ بلکہ عدمِ شفاعت پر جابجا اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ

اُس دن سے ڈرو۔ جب کوئی شخص اپنے آپ کو پیش کر کے دوسرے کو نہیں بچا سکے گا۔ جب کوئی شفاعت قبول نہیں

مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (قرآن)

کی جائے گی، نہ جرمانہ دے کر جان بخشی ہو گی، اور نہ کسی قسم کی مدد مجرم کے کام آسکے گی۔

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ (قرآن)

قیامت کے دن ظالموں کے لیے نہ کوئی شفیع ہو گا نہ حمایتی۔

خود آنحضرت صلعم کے کئی اقوال اس موضوع پر موجود ہیں۔

یا فاطمہ بنت محمد، و یا صفیہ بنت عبدالمطلب و یا بنی عبدالمطلب۔ لا املك لکم من اللّٰہ شیئًا سلونی من مالی ما شئتم (مسلم ج ۱ صفحہ ۲)

اے فاطمہ بنت محمد۔ اے صفیہ بنت عبدالمطلب اور آل عبدالمطلب! یاد رکھو کہ میں اللہ کے دربار میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ ہاں اگر مال درکار ہے تو جو کچھ میرے پاس موجود ہے، وہ لے لو۔

یہ حدیث قرآن کے عین مطابق ہے۔ جب ہر عمل کا صلہ مقرر ہو چکا ہے جس میں کمی بیشی کی گنجائش ہی نہیں۔ اور جب ازل سے اللہ تعالیٰ اسی ایک نہج پر مصروفِ عمل ہے۔ اور بار بار کہہ چکا ہے کہ ہم اپنے طریقوں کو بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ تو پھر شفاعت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح مریض کی سب سے بڑی سفارش موزوں دوا اور ہدایات طبیب کی پابندی ہے۔ اسی طرح ہمارے لیے سب سے بڑی شفاعت احکام رسول کی تعمیل ہے۔ جس طرح ایک بد احتیاط مریض کو

طبیب کی کوئی آرزو یا دعا مرض سے نہیں بچا سکتی۔ اسی طرح ایک نافرمان کے لیے حضور کی کوئی دعا یا سفارش مفید نہیں ہو سکتی۔

"اگر تم منافقین کے لیے ستر مرتبہ بھی سفارش کرو۔ پھر بھی ہم نہیں سنیں گے"
(قرآن)

حضور نے ام زبیر اور حضرت فاطمہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

لا اغنی لکما من اللہ شیئاً سلانی من مالی ما شئتما

میں تمہیں اس کے عذاب سے قطعا نہیں بچا سکوں گا۔ البتہ میرا مال ضرورت ہو تو حاضر ہے

(بخاری ج ۱ صفحہ ۱)

یہ تو تھا اس مسئلہ کا قابل قبول اور قرآنی پہلو۔ اب ذرا محدثین کا نقطۂ نگاہ ملاحظہ کیجیے۔

"ابو ہریرہ سے روایت ہے۔ کہ قیامت کے دن سب سے پہلے لوگ حضرت آدم کے پاس جائیں گے اور شفاعت کی التجا کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں نے تو دانۂ گندم کھا لیا تھا اس لیے اللہ کے سامنے جانے سے ڈرتا ہوں پھر ابراہیمؑ کے پاس جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں نے تو تین جھوٹ بولے تھے۔ اس لیے مجھے معاف کرو۔ اس کے بعد موسیٰ کے پاس جائیں گے وہ کہیں گے کہ میں نے ایک قبطی کو قتل کیا تھا۔ اس لیے میں خدا کے سامنے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ پھر عیسیٰؑ کے پاس جائیں گے وہ کہیں گے نفسی نفسی تم محمد کے پاس جاؤ آخر میں لوگ (صلعم)

کے پاس جائیں گے۔ اور آپ اللہ کے حضور میں روانہ ہوجائیں گے۔ الخ
(ملخص مسلم ج ا۔ صت ۱۲۲)

کیا دلچسپ حدیث ہے کہ رسول خدا صلعم کو اُس ابراہیمؑ سے بھی بڑا بنا دیا۔ جن کی اتباع کا آپ کو بار بار حکم دیا گیا تھا۔ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا د تم موحد ابراہیم کے آثارِ قدم پہ چلو) اور آپ پر تین جھوٹ بولنے کا بھی الزام لگا دیا۔ اچھا مان لیا کہ آدمؑ نے دانہ کھایا تھا۔ ابراہیمؑ نے جھوٹ بولے تھے۔ موسیٰ نے قتل کیا تھا۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ نے کیا قصور کیا تھا۔ کہ انھیں شفاعت کی اجازت نہ مل سکی۔ اور حضرت نوحؑ۔ ادریسؑ۔ زکریا۔ ہارون۔ یونس اور یوسف علیہ السلام میں کیا کمی تھی؟

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق تو خود حضور کا ارشاد موجود ہے۔ کہ آپ اکرم الناس تھے۔

عن ابوھریرۃ قیل یا رسول اللہ من اکرم النّاس قال اتقاھم۔ فقالوا لیس عن ھذا نسألک قال فیوسف نبی اللہ۔ (بخاری ج ۲ صـ۱۵۲)	ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضورؐ سے کسی نے پوچھا کہ دنیا کا بہترین انسان کون ہے؟ فرمایا سب سے بڑا پرہیزگار۔ کہا میرے سوال کا یہ مطلب نہیں تھا فرمایا تو پھر حضرت یوسف علیہ السّلام

حیرت ہے کہ اس اہم کام یعنی شفاعت کے لیے دنیا کا بہترین انسان کیوں منتخب نہ ہو سکا۔ اور کیوں حضرت ابوہریرہؓ نے شفیعوں کی فہرست سے

آپ کا نام کاٹ دیا ؟

اگر کسی طالب العلم کو ایک سال پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ امتحان میں کچھ لکھے یا نہ لکھے، وہ بہر رنگ کامیاب ہو جائے گا۔ تو وہ یقیناً کام چھوڑ کر آوارہ گردی شروع کردے گا۔ احادیث شفاعت میں اس قسم کا ایک وعدہ آنحضرت صلعم سے بھی کیا جا چکا ہے۔

..... فقال اللّٰہ یاجبریل اذھب الی محمد فقل انا سنرضیک فی امتک ولا نسوٴک

رسول اللہ صلعم رو رہے تھے.... کہ اللہ نے جبریل سے کہا۔ اے جبریل محمد (صلعم) کے پاس جاؤ اور اُنھیں ہماری طرف سے کہو کہ ہم تمھیں تمھاری اُمّت کے متعلق خوش کرینگے اور مغموم نہ ہونے دیں گے۔

(مسلم ج ۱ صہ ۲ ۳ ۴)

اس وعدہ کی رو سے ہم سب کو جنّت میں تو پہنچ ہی جانا ہے۔ پھر کام کیوں کریں۔ نمازیں کیوں پڑھیں۔ روزے کیوں رکھیں۔ اور جہاد کے خوفناک مصائب کیوں برداشت کریں ؟

پندرہواں باب

قرآن سے متصادم احادیث

بخاری و مسلم میں ایسی احادیث کی کمی نہیں جو قرآن سے متصادم ہوتی ہیں۔ مثلاً قرآن میں مذکور ہے:

اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا۔ (قرآن)
ہم نے انسان کو صحیح راہ دکھا دی ہے اب وہ چاہے تو سیدھا راستہ اختیار کرے یا اُلٹا۔

مَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ۔ (قرآن)
جس کا دل چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ۔ (قرآن)
آپ کا کام صرف تبلیغ ہے۔ آپ ان پہ دارو غہ نہیں لگائے گئے۔

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۔ (قرآن)
کیا اس فکر میں تم خودکشی کر لو گے کہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے؟

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔
دین میں کوئی جبر نہیں۔

ایک حاکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی قلمرو میں امن قائم کرنے

کے لیے جرائم کا استیصال کرے۔ اگر کسی سلطنت میں دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہوں۔ کسی عورت کی عصمت محفوظ ہو اور بات بات پہ قتل ہوتے ہوں، تو وہاں امن قائم نہیں ہو سکتا اور فرمانروا کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ رعایا کی جان، مال و عزت کی حفاظت کرے۔ اس کو انگریزی زبان میں (TO ENFORCE LAW AND ORDER) کہتے ہیں یعنی ملک میں تلوار کے زور سے قانون نافذ کرنا امن کی خاطر چند قوانین کو بزور شمشیر اپنی سلطنت میں نافذ کرنا الگ چیز ہے۔ اور کسی کو بہ جبر مسلمان بنانا الگ۔ انگریز اپنے دورِ حکومت میں قانون کا احترام کرانے کے لیے ہر قسم کی سختی کرتے رہے لیکن کسی گورنر نے ہمیں عیسائی بننے کے لیے کبھی مجبور نہیں کیا تھا اس نازک فرق کو سمجھنے کے بعد اب یہ آیت پڑھیئے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَتَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ

(قرآن)

تم کفار سے اس وقت تک لڑو جب تک بدامنی ختم نہ ہو جائے اور ہمارا قانون قلمرو میں نافذ نہ ہو جائے۔

مطلب یہ کہ دین کے دو معنی ہیں اوّل۔ سارا ضابطہ اسلامی۔ دوم اس ضابطہ کا وہ حصّہ جس کا نفاذ قلمرو میں قیامِ امن کے لیے ضروری ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ۔ میں دین سے مراد سارا قرآن ہے۔ اور دوسری آیت میں وہ حصہ جو قیامِ امن کے لیے ضروری ہے۔ اِس لیے اِن آیات میں کوئی تضاد نہیں۔

اب یہ حدیث ملاحظہ ہو۔

اُمرتُ ان اقاتل النّاس حتی یشہدوا ان لآ الٰہ الّا اللہ و انّ محمد الرسول اللّٰہ و یقیموا الصلواۃ و یوتوا الزکواۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی اموالھم و دماءھم الا بحق الاسلام و حسابھم علی اللّٰہ (بخاری ج ۱ ص ۔)	مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اُس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ خدا کو ایک مان کر میری رسالت کا اقرار نہ کریں اور صلواۃ و زکواۃ کے پابند نہ ہو جائیں۔ اگر وہ ان باتوں کو مان لیں تو پھر میں اُن کی جان اور مال سے کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ ہاں جان و مال میں اللہ کے حقوق کسی طرح ساقط نہیں ہونگے۔

یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے :

اوّل : قرآن حکیم نے بد امنی کے روکنے اور مظالم کے انسداد کے لیے جہاد کا حکم دیا ہے ۔ نہ کہ قرآن کی تعلیم زبردستی منوانے کے لیے۔ قرآن میں بار بار یہی حکم دیا گیا ہے کہ ظالموں ، بد عہدوں اور فتنہ پردازوں سے لڑو۔ لیکن اگر مندرجہ ذیل چار صورتوں میں سے کوئی پیدا ہو جائے تو جنگ ختم کر دو :

اوّل۔ جب فتنہ اور بد امنی ختم ہو جائے۔

دوم۔ جب دشمن سے صلح ہو جائے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا ۔ (قرآن)	اگر وہ صلح چاہیں، تو اُن سے صلح کر لو۔

سوم۔ جب وہ جزیہ دینے پہ راضی ہو جائے۔

... حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صَاغِرُوْنَ

یہاں تک کہ وہ ہار مان کر جزیہ دینے پہ راضی ہو جائیں۔

چہارم۔ جب وہ اسلام قبول کرے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ

اور اگر وہ توبہ کرنے کے بعد صلوٰۃ و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو پھر اُن کے راستے سے ہٹ جاؤ۔

(قرآن)

سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات میں مشرکین کے خلاف اعلانِ جنگ کی وجہ یہ نہیں بتائی گئی، کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ یہ کہ انھوں نے تمام معاہدات توڑ دیئے تھے۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّکَثُوْا اَیْمَانَھُمْ .... الخ

تم اُن مشرکین سے کیوں جنگ نہیں کرتے، جنھوں نے سارے معاہدات توڑ ڈالے ہیں۔

(سورۂ توبہ)

اور جن مشرکین نے معاہدات کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ اُن کے متعلق کہا گیا۔

.... فَاَتِمُّوْا اِلَیْھِمْ عَھْدَھُمْ۔

کہ تم بھی اُن معاہدوں کو پورا کرو۔

اور ساتھ ہی یہ رعایت دی گئی۔ کہ

"اگر کوئی مشرک تمھارے ہاں پناہ لینے آئے، تو انکار نہ کرو"۔ (توبہ)

چونکہ یہ حدیث لوگوں کو بہ جبر مسلمان بنانے کے لیے جہاد کا حکم دیتی

ہے۔ اور قرآن کی تعلیم سے متضاد ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی صحت مشتبہ ہے۔

دوم۔ حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبل کو اہلِ بحرین سے جزیہ وصول کرنے کے لیے بھیجا تھا (بخاری ج ۲ ص ۱۳۱) حالانکہ وہ لوگ غیر مسلم تھے۔ اور اس حدیث کی رُو سے اُن کے خلاف جہاد کرنا چاہیے تھا۔

سوم۔ حضور علیہ السلام نے جنگِ خیبر میں حضرت علی سے فرمایا تھا کہ

ثم ادعهم الی الاسلام فواللہ لان یهدی اللہ بک رجلا خیر لک من حمر النعم۔ (بخاری ج ۲ ص ۱۱۳)	اور پھر تم انھیں اسلام کی طرف دعوت دو اور یاد رکھو کہ ایک انسان کا ہدایت پا جانا تمھارے لیے سُرخ اُونٹ سے بہتر ہے۔

یہ نہیں فرمایا کہ غیر مسلم کو قتل کردو۔ اور جب تک وہ مسلمان نہ ہو جاتے۔ جنگ جاری رکھو۔

چہارم۔ موطا میں مذکور ہے۔

"ایک اعرابی نے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور پھر کہنے لگا میں بیعت کو توڑتا ہوں۔ تین مرتبہ یہی التجا دہرائی لیکن آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ مدینہ ایک بھٹی کی طرح ہے۔ جہاں خالص دھات باقی رہ جاتی ہے۔ اور کثافت نکل جاتی ہے"۔ (موطا ص ۲۵۹)

• اس موقع پر حضورؐ نے اس مرتد سے جنگ نہیں کی۔ بلکہ خاموش رہے۔ جس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام میں کسی کا مذہب بہ جبر تبدیل کرنے کی کوئی ہدایت موجود نہیں۔ اور اس لیے حدیث زیرِ نظر وضعی ہے۔

اور یہ حدیث بھی۔

من بدّل دینہ فاقتلوہ۔ کہ جو شخص اسلام چھوڑ جائے اُسے مار ڈالو۔
(بخاری ج ۲ ص ۱۱۳)

سولھواں باب

غلامی اور اسلام

لارڈ ہیڈلے فاروق جب مسلمان ہوئے، تو آپ نے انگلستان کی مسجد میں اسلام پر ایک تقریر کی جس میں اسلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں کہا:

"قرآن میں ایک نقص بھی ہے کہ وہ حکومت کرنے کے تو سب گر بتاتا ہے۔ لیکن یہ گر نہیں بتاتا کہ اگر مسلمان غلام ہو جائے تو وہ کیا کرے۔ سارے قرآن میں غلام مسلمان کے لیے ایک بھی ہدایت موجود نہیں۔"

بدیگر الفاظ لارڈ فاروق یہ کہہ گئے کہ قرآن جہانبازوں کا دستور العمل ہے نہ کہ غلاموں کا۔ اور اس مقدس کتاب پر عمل کرنے کا لازمی نتیجہ آقائی و فرمانروائی ہے۔ لارڈ فاروق کی تائید میں سارا قرآن پیش کیا جا سکتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْكُمْ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

ہم اُن اہلِ ایمان سے جن کے اعمال صالح (حکومت کی صلاحیت پیدا کر دیتے) ہوں یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم انھیں سلطنت دینگے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۔ (قرآن)	ہم نے قانون زندگی کی تفصیل کے بعد داؤد کی کتاب زبور میں لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے وہ بندے ہوں گے جن کے اعمال صالح ہوں گے
وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (قرآن)	اگر تمہارا ایمان قائم رہا تو تم ہی سربلند رہو گے
إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (قرآن)	اللہ جسے چاہے زمین کا وارث بنا دیتا ہے لیکن عاقبت کار فتح اہل تقویٰ کو ہوا کرتی ہے
وَاللَّهُ يَدْعُوا إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ (قرآن)	خدا ایک ایسی زندگی کی طرف دعوت دیتا ہے جس میں خوف نہ ہو۔

یعنی غلامی کا خوف۔ بھوک کا خوف۔ گناہ کا خوف اور احتساب کا خوف۔

إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (قرآن)	اللہ کی جماعت دنیا میں یقیناً غالب رہے گی۔

کہاں تک لکھوں، اس مضمون پہ دس بیس نہیں سینکڑوں آیات موجود ہیں قرآن کی یہ وہ تعلیم تھی۔ جس سے ہمارے دشمن خوف کھایا کرتے تھے۔ عصر حاضر کا مشہور مصنف۔ ایچ۔ جی۔ ویلز اپنی کتاب "تاریخ الاقوام" میں لکھتا ہے۔

"گو اس وقت دنیا کے مسلمان بھوکے۔ پراگندہ۔ جاہل اور سخت کمزور ہیں۔ لیکن ان کے پاس ایک زبردست انقلابی کتاب موجود ہے۔ جو انھیں کسی وقت بھی نئی زندگی دے کر دنیا کی خوفناک طاقت بنا سکتی ہے"۔ ...... ملخّص

اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم ہمارا شکار کھیل رہی ہے۔ ہمیں خریدنے کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے ہمیں پھانسنے کے لیے گہرے منصوبے باندھے جاتے ہیں۔ ہمیں سُلانے کے لیے مؤثر مسکرات تیار کیے جاتے ہیں۔ اور ہمیں اس منبع قوت وہیبت یعنی قرآن سے دُور رکھنے کے لیے مختلف وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔ انگریز نے اپنی حکومت میں اُس زبان ہی کو ختم کر دیا جس میں قرآن لکھا ہوُا تھا۔ تسبیح و قوالی والے پیروں کو ہم پہ مسلّط کر دیا۔ اہل دِل کو نظر بند کر دیا۔ اور جاہل واعظین کو چھٹی دے دی۔ کہ دیہات میں پھر پھر کر ہمارے عقائد کا حلیہ بگاڑتے پھریں اور یہ قدم صرف انگریزوں ہی نے نہیں اُٹھایا تھا۔ بلکہ آج سے تیرہ سو برس پہلے شہنشاہانِ روما بھی اسی قسم کے وسائل سے کام لیتے تھے۔ اُنھوں نے بے شمار علما خرید رکھے تھے۔ جن کا کام احادیث تراشی تھا۔ تاکہ مسلمان قرآن سے کٹ کر اس نئے اسلام کا گرویدہ ہو جائے۔ اور آئے دن کے حملوں سے اُن کی جان چھوٹ جائے۔ حدیث ذیل کچھ ایسے ہی حالات کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔

للعبد الصالح المملوک ایک نیک غلام دگنے اجر کا مستحق ہے

اجوان والذی نفسی بیدہٖ	اللہ کی قسم اگر جہاد و حج مانع نہ ہوتے
لولا الجہاد فی سبیل اللہ و	تو میں موت تک غلام رہنا پسند کرتا۔
الحج ....لہ لاحببت ان اموت	(بخاری ج ۲ ص۳۵)
و انا مملوک۔	

تو گویا حدیث یہ کہہ رہی ہے۔کہ بہترین زندگی دوسروں کی غلامی ہے۔
یعنی ان کے پنکھے کھینچنا۔ لکڑیاں کاٹنا۔ بوجھ اٹھانا۔ پانی بھرنا اور ہل
جوتنا۔

اِن غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!
(اقبالؒ)

لہ یہ لفظ پڑھ نہ سکا۔

سترہواں باب

تقدیر

تقدیر کا ماخذ ہے "قدر" جس کے معنی ہیں تولنا، ناپنا، معین کرنا۔
... اللہ نے تخلیق اعمال کے بعد ہر عمل کو تولا، ناپا اور ایک صلہ ہمیشہ
کے لیے معین کر دیا۔ جو اس عمل سے کسی صورت میں بھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔
ہر زمانے میں کاہلی کا نتیجہ ناکامی، محنت کا کامیابی، بداعمالی کا رسوائی،
جہالت کا ذلت، علم کا عزت، عبادت کا پاکیزگی، اور بلند کردار کا رفعت
رہا ہے۔ یہ نتائج کسی قوم، کسی عقیدے، کسی دعا، کسی منتر، کسی چلّے،
یا کسی عبادت کی وجہ سے نہ آج تک بدلے نہ آئندہ بدلیں گے۔ انسان
اعمال کے انتخاب میں آزاد ہے۔ وہ چاہے تو شریف بنے، یا شریر، محنتی بنے
یا کاہل۔ لیکن نتائج بھگتنے پر مجبور ہے۔ یہی "تقدیر" ہے۔ اور
اسی کا نام "قضائے الٰہی" ہے۔ انسان اپنی تقدیر کا معمار خود ہے۔
وہ صرف اپنی کوششوں کا پھل پاتا۔ اور اپنی تباہ کاریوں سے نقصان
اٹھاتا ہے۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی — انسان کو صرف اپنی کوششوں کا پھل

وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی — ملتا ہے۔ اور اُس کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

(قرآن)

اِنَّا لَا نُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی۔ — ہم کسی محنتی مرد یا عورت کی محنت کبھی برباد نہیں جانے دیتے۔

اس مضمون پہ قرآن میں بیسیوں آیات موجود ہیں۔ اور نوعِ انسانی کی ہزارہا سالہ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ دنیا دارالمکافات ہے جہاں صرف اپنی محنت کام آتی ہے۔ اور بے عمل، بدعمل، کاہل اور سہل انگار افراد اقوام کا انجام ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ہمارا اپنا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ ایک نکما طالب العلم آج تک کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ ایک بدکار کبھی معزز نہیں بن سکا۔ ایک چرسی اور افیونی کبھی عمدہ صحت کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکا۔ اور ایک بزدل فوج کبھی میدان نہ جیت سکی۔ الغرض قرآن، تاریخ اور مشاہدہ بہ بانگ دہل کہہ رہے ہیں کہ انسان انتخاب اعمال میں آزاد ہے۔ لیکن نتائج اعمال برداشت کرنے پہ مجبور ہے۔ ہر قوم کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ چاہے تو بلند اعمال کی بدولت دنیا کی مالک بن جائے اور چاہے تو پست کرداری کی وجہ سے جہاں بھر میں رسوا ہو جائے ؎

کافر ہے، تو تقدیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے، تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

(اقبالؒ)

یہ تھا تقدیر کا قرآنی تخیّل۔ اب ذرا "حدیثی تخیّل" ملاحظہ ہو:

"حضورؐ فرماتے ہیں۔ کہ نطفہ رحم میں پہنچ کر چالیس دن کے بعد منجمد سا خون بنتا ہے۔ پھر وہ لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے کہ جاؤ اور اس لوتھڑے کے اعمال زندگی۔ رزق۔ موت اور سعادت و شقاوت کا فیصلہ ابھی لکھ لو۔ اور اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے"۔ ۔ ۔ ۔ الخ (ملخص بخاری ج ۲ ص ۱۳۸)

اس حدیث تراش نے یہ نہ بتایا۔ کہ جب ایک شخص کے اعمال۔ رزق اور سعادت و شقاوت کا فیصلہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی ہو جاتا ہے تو پھر اللہ نے انسانی ہدایت کے لیے اتنے پیغمبر کیوں بھیجے۔ بے شمار اقوام کو غرق کیوں کیا۔ اور چور کے ہاتھ کاٹنے کا کیوں حکم دیا۔ جب خود اللہ اس کی تقدیر میں چوری لکھ چکا تھا۔ تو پھر یہ غریب اللہ کی تحریر کو کیسے مٹا سکتا تھا۔ اس کی مشیت اور مرضی کے خلاف کیسے جا سکتا تھا۔ ان حالات میں اُسے سزا دینے کا مطلب: خود ہی فیصلہ کرنا کہ چوری کرو اور جب وہ اس فیصلے کو عملی شکل دے چکے، تو حکم دے دینا کہ اس کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ عجب مذاق ہے۔ کسی کو ہدایت دے کر جنت میں بھیجنا اور کسی کو گمراہ کر کے جہنم کے حوالے کرنا بے انصافی کی انتہا ہے کسی کو نیک بنا کر تخت سلطنت پہ بٹھانا، اور کسی کو چور بنا کر اس کے سامنے سزا کے لیے پیش کرنا عجیب ستم ظریفی ہے۔ یہ سب الجھنیں اس لیے

پیدا ہوئیں کہ ہم نے قرآنی تقدیر کو چھوڑ کر حدیثی تقدیر کا تخیل اپنا لیا اور پھر لگے انتہائی اندھیرے میں ٹاک ٹوئیے مارنے۔

آج ساری دنیائے اسلام حدیثی تقدیر کے مہلک تصوّر میں گرفتار ہے ہر جگہ پٹ رہی ہے۔ ہر مقام پر رسوا ہو رہی ہے۔ اور پھر بھی اس زعم میں مست ہے کہ اللہ کی مرضی یہی تھی۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اے او مخبوط الحواس! تو اپنی جہالت، کاہلی، کام چوری، غلاظت، بدکرداری اور بدعقیدتی کو خدا کی مرضی بنائے پھرتا ہے۔ خدا کی مرضی کی تفصیل قرآن میں درج ہے، اور تو اُسے دیکھتا نہیں۔ دیکھتا ہے، تو سمجھتا نہیں کیا اللہ نے ایک ہزار سے زیادہ مرتبہ قرآن میں نہیں کہا، کہ بلند اعمال کا صلہ بلند اور پست کا پست ہے۔ یہ خدا کی مرضی کی تفسیر نہیں تو اور کیا ہے؟ اے سوئے ہوئے مسلمان! اُٹھ جاگ۔ اوہام و عقائد کے یہ سنہرے سلاسل توڑ دے اور شمشیرِ عمل ہاتھ میں لے کر آگے بڑھ، کہ مدت سے دنیا کے میدان تیرا انتظار کر رہے ہیں ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے۔ دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں روحِ عمل کا حساب

اٹھارھواں باب

متضاد حیثیت

(پیاری ماں)

مرد اور عورت کے فرائض حیات پر نظر ڈالی جائے تو عورت بظاہر نہایت دکھیا نظر آتی ہے جب تک وہ بیٹی ہوتی ہے صبح سے شام تک گھربار کے کام میں مصروف رہتی ہے۔ یہ ہانڈی۔ یہ چکی۔ یہ صفائی، یہ برتن مانجھنا۔ یہ کپڑے دھونا۔ یہ سب کو کھانا کھلانا۔ بستر لگانا وغیرہ وغیرہ۔ کب ساری دنیا کھا پی کے سوئے کہ اس بیچاری کو بھی چند لمحات کے لیے آرام نصیب ہو۔ ماں بنی تو جھمیلے اور بڑھ گئے۔ نو ماہ تک کئی سیر بوجھ پیٹ میں اٹھائے پھرنا۔ وضع حمل کی سختیاں اور کراہیں۔ دو سال تک بچے کو سیر دو سیر دن خون پلانا۔ جاڑے کی راتوں میں بار بار اٹھ اٹھ کر بچے کا پیشاب اور پاخانہ دھونا۔ خدا خدا کر کے ایک چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو اوپر سے دوسرا آگیا۔ پھر وہی مصیبتیں۔ وہی دو سال کا نہایت پریشان کن زمانہ۔ گھر کا کام کاج علاوہ۔ بچے کو سنبھالے کہ ہانڈی پکائے۔ جھاڑ پونچھ کرے کہ روٹی تیار کرے پانی بھرے کہ کپڑے دھوئے۔ دودھ

بلو سے کہ برتن مانجھے، ایک جان اور لاکھوں بکھیڑے سے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ایک بچے کا پالنا آرام و جان کی بہت بڑی قربانی مانگتا ہے اور یہ مخلص پیکر، ایثار اور مجسم محبت اس مشکل فرض کو اس خندہ پیشانی اور خوبی سے سر انجام دیتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس پر لاکھوں جنتیں قربان کر دی جائیں۔

"ابو سعید خدری بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ چند عورتوں نے آنحضرت صلعم سے کہا۔ کہ آپ کا تمام تر وقت مردوں کی تہذیب و اصلاح میں گذر جاتا ہے۔ اور ہم آپ کے ارشادات سے محروم رہتی ہیں۔ اس لیے ایک دن نکال کر ہمیں بھی مستفید ہونے کا موقع عطا فرمائیے۔ حضورؐ نے یہ التجا منظور فرما لی۔ اور عورتوں کے ایک مجمع کو خطاب کیا۔ دوران تقریر میں فرمایا کہ جس عورت کے تین بچے فوت ہو جائیں گے۔ اللہ اُسے نارِ جہنم سے بچا لے گا۔ ایک عورت کہنے لگی، اور دو بچوں والی؟ فرمایا۔ دو والی بھی جنت میں جائے گی۔"

(بخاری ج ۱ ص ۲۰)

بالکل درست فرمایا تھا حضورؐ نے۔ ہمارا قرآن شاہد ہے کہ انسانی خدمت بہت بڑے اجر کی مستحق ہے تو کیا بچوں کی تولید و تربیت انسانی خدمت

نہیں! کیا بچہ انسان نہیں ہوتا؟ کسی اندھے کو راہ دکھانا۔ کسی پیاسے کو پانی پلانا۔ کسی بھوکے کو روٹی کھلانا۔ کسی مریض کے لیے ہسپتال سے دوا لے آنا۔ کسی یتیم کو دو کپڑے سلا دینا۔ اور کسی ضعیف کو سہارا دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ اگر مشکل اور نہایت مشکل ہے، تو بچے کو نو ماہ تک اٹھائے پھرنا۔ موت و حیات کے انفصالی نقاط پہ پہنچ کر اسے جنم دینا۔ دو سال خون پلانا۔ اور زندگی بھر اس پہ قربان ہوتے رہنا۔ اندازہ کیجیے۔ کہ انسانی خدمت کا یہ کتنا لاجواب شاہکار ہے۔ اگر حضورؐ نے دو بچوں والی ماں کو جنت کی بشارت دے دی تھی، تو حقیقتاً اس کی جاں گداز خدمات۔ اور ان کی وفات پہ اس کے صبر کا نہایت موزوں و مناسب صلہ تجویز فرمایا تھا۔

اِس کائنات میں سب سے گراں بہا متاع بے لوث محبت ہے۔ محبت کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً مال و زر سے محبت۔ اپنے آپ سے محبت حسن سے محبت وغیرہ وغیرہ لیکن محبت کی ان تمام اقسام کے پیچھے چند اغراض کارفرما ہوتی ہیں۔ اگر کوئی محبت ان تمام کثافتوں سے پاک۔ اور ہر قسم کی آلائشوں سے صاف ہوا کرتی ہے، تو وہ ہے ماں کی محبت۔ وہ دیکھو مرغی کے بچے پہ چیل جھپٹی کس بے قراری کے ساتھ مرغی شور مچاتی ہوئی ہوا میں اڑی۔ اس کی کلغی اڑ گئی اور ایک آنکھ بچھر گئی۔ لیکن اس نے اپنے لخت جگر کو موت کے شکنجے سے [illegible] لیا۔ کیا اس بچے سے مرغی کی کوئی غرض وا[illegible] تھی؟ نہیں۔ صرف مامتا۔

یعنی محبّت کی خاطر محبّت۔ اور قربانی کی خاطر قربانی۔ میرا یہ دعوےٰ ہے کہ محبت کی یہ پاکیزگی ماں کے سوا کہیں اور قطعی نہیں ملتی۔ چونکہ بابِ جنّت کی کلید صرف محبّت ہے۔ اللہ سے محبّت۔ اور اس کی کائنات سے محبّت۔ اور محبّت کا سب سے بڑا خزانہ ماں ہے۔ اس لیے وہ لوگ یقیناً جنّتی ہیں جو ماں سے یہ جوہر درانت میں پاکر ساری کائنات کے لیے محبّت و رحمت بن جاتے ہیں۔ درست فرمایا تھا مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلّم نے

اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّھَاتِکُمْ — جنّت تمھاری ماؤں کے پاؤں تلے ہے

عورت کی عظمت و رفعت کا کتنا شاندار اعتراف ہے۔ ہمیں یورپ طعنے دیتا ہے کہ اسلام نے عورت کو گھر کی چار دیواری میں بند کر رکھا ہے۔ اُسے مرد کا غلام بنا دیا ہے اور معاشرت میں اُس کو موزوں مقام حاصل کرنے سے روک دیا ہے خود یورپ نے عورت کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ اسے نیم برہنہ کر کے کلبوں اور تفریح گاہوں میں غیر مردوں کے ساتھ ناچ کی کھلی چھٹی دے دی۔ لیکن دوسری طرف اسلام نے جنّت کی لازوال بہاریں اُس کے پاؤں پہ قربان کر ڈالیں کہو عورت کو کس نے بلند کیا۔ اسلام نے یا یورپ نے؟

مری نوا سے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

ایک طرف تو عورت کی عظمت کا یہ حقیقت افروز اعتراف۔ اور دوسری طرف اس پرستار محبت کی یہ توہین۔ کہ

رایت النار فاذا اکثر اھلھا النساء

آنحضرت فرماتے ہیں کہ میں نے جہنم کو دیکھا تو اس میں اکثر آبادی عورتوں کی نظر آئی۔

(بخاری ج ۱ ص ۹)

یعنی ایک طرف تو دودھ پلانے والی ماؤں کو جنتی بنایا جارہا ہے۔ بلکہ ساری جنت ماں کے قدموں میں پھینکی جارہی ہے اور دوسری طرف اس کے جہنمی ہونے کا بھی ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے۔ چوریاں کریں تو مرد۔ ڈاکے ڈالیں تو مرد۔ جیبیں کتریں تو مرد۔ قتل کریں تو مرد۔ بغاوت کی آگ بھڑکائیں تو مرد۔ جوا کھیلیں تو مرد۔ بچوں۔ بوڑھوں اور عورتوں کو نہایت بے رحمی سے قتل کریں تو مرد (مشرقی پنجاب کے واقعات یاد کرو) لیکن جہنم میں جائیں تو عورتیں۔ کیوں؟ کیا اللہ کے عدل و انصاف کا تقاضا یہی ہے؟

آگ سے عذاب دینا

"ابو ہریرہ رضہ کہتے ہیں، کہ رسول اللہ صلعم نے ہمیں ایک مہم پر روانہ کرنے سے پہلے فرمایا۔ کہ اگر فلاں فلاں تمھیں مل جائیں تو انھیں آگ میں جلا دینا۔ اور جب ہم چل پڑے۔ تو کہا ان لوگوں کو جلانا مت بلکہ قتل کر ڈالنا۔ اس لیے کہ آگ سے عذاب دینا صرف اللہ کا کام ہے"۔

(بخاری ج ۲ ص ۱۳)

"آگ سے عذاب دینا صرف اللہ کا کام ہے لیکن :
حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ کہ چند آدمی مدینہ میں آکر بیمار ہوگئے۔ حضورؐ نے انہیں اجازت دیدی کہ وہ سرکاری اونٹنیوں کا دودھ پئیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ شفایاب ہوکر تروتازہ ہوگئے، تو انھوں نے رکھوالے کو مار ڈالا، اور اونٹنیوں کو ہانک کر چل دیئے۔ جب یہ خبر آنحضرتؐ تک پہنچی تو آپ نے کچھ آدمی روانہ کیے جو انھیں پکڑ کر لے آئے۔ آپ نے انھیں مندرجہ ذیل سزائیں دیں؛
(الف) پہلے اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹے۔
(ب) پھر لوہے کی سلاخیں گرم کرکے ان کی آنکھوں میں پھیریں۔
(ج) اس کے بعد انھیں گرم ریت پہ پھینک دیا۔ وہ تڑپ تڑپ کر پانی مانگتے رہے۔ لیکن کسی نے نہ دیا۔ اور ہلاک ہوگئے۔"

(ملخص بخاری ج ۲ صہ ۱۱۳)

یہ بے رحمی رحمۃ للعالمین کی شان سے بعید ہے۔ مزید براں قرآن نے قاتل کے لیے صرف سزائے موت تجویز کی ہے۔ نہ کہ یہ تین سزائیں بیک وقت۔ ہاں باغیوں کے لیے چار سزائیں مقرر ہیں۔

اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ — کہ وہ یا تو قتل کر دیئے جائیں یا سولی دیئے جائیں، یا اُن کا ایک ہاتھ اور ایک

مِنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ   پاؤں کاٹ دیا جائے اور یا جلاوطن کر دیئے جائیں۔
(قرآن)

لیکن ان چار سزاؤں میں سے صرف ایک کی اجازت ہے۔ اللہ کا ارشاد واضح ہے کہ یا یہ سزا دو اور یا وہ۔ خود حضورؐ کا ارشاد موجود ہے کہ آگ سے عذاب دینا صرف اللہ کا کام ہے۔ پھر گرم سلاخوں سے اُن کی آنکھیں کیوں نکالی گئیں؟

کیا گھوڑا منحوس ہے؟

ہم صفحاتِ گذشتہ میں یہ حدیث لکھ چکے ہیں کہ" اللہ تعالےٰ نے گھوڑوں کی پیشانی کو قیامت تک مبارک قرار دیا ہے"۔ قرآن حکیم میں بھی گھوڑے پالنا کا حکم دیا گیا ہے۔ اور حضورؐ نے خود بھی ایک گھوڑا پال رکھا تھا۔

" حضرت سہیل فرماتے ہیں۔ کان للنّبیّ فی حائطنا فرسٌ یقال لہ اللحیف کہ ہمارے ہاں حضورؐ کا ایک گھوڑا بندھا رہتا تھا جس کا نام لحیف تھا"

(تجرید البخاری صہ ۵۳۹ طبع دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور)

لیکن عبداللہؓ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

انما الشؤم فی ثلثۃ فی الفرس والمرأۃ والدار   تین چیزیں منحوس ہیں۔ گھوڑا۔ عورت اور مکان۔

(تجرید البخاری صہ ۵۴۰)

اس ارشاد کا مقصد تو یہی ہو سکتا ہے کہ لوگ ان منحوس چیزوں سے

بچیں لیکن لوگ کیسے بچ سکتے تھے۔ جب خود حضورؐ کے پاس ایک گھوڑا، گیارہ بیویاں اور نو مکانات موجود تھے۔ اگر کوئی عقلمند ہم سے پوچھ بیٹھے کہ کیا یہ قول اسی رسول کا ہے جس نے ماؤں کے قدموں میں جنّت کا پتہ دیا تھا۔ اور جس نے فرمایا تھا۔ کہ" نکاح میری سنت ہے، جو اِس سنت کو چھوڑ دے گا، وہ ہم سے کٹ جائے گا" تو ہم کیا جواب دیں گے! پھر یہ بھی تو واضح کیا ہوتا۔ کہ یہ تین چیزیں منحوس کیوں ہیں کیا جن عورتوں نے لاکھوں انبیا و اولیا پیدا کیے جن کی گود میں لقمان و افلاطون کھیلے۔ جنھوں نے اتاترک۔ قائد اعظم۔ اقبال سعدی۔ رومی۔ رازی۔ سینا اور فارابی جیسے عظیم الشان محسنین نسل انسانی کو جنم دیا۔ وہ منحوس ہیں۔

نمازیں بھُولنے کی وجہ

"ابوہریرہؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان پاد تا ہوُا بھاگ نکلتا ہے۔ اور اذان کے بعد واپس آجاتا ہے۔ جب نمازی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ پھر بھاگ جاتا ہے۔ اور پھر نماز شروع ہونے کے بعد واپس آ کر نمازی پہ مسلّط ہو جاتا ہے اُسے بھولی ہوئی باتیں یاد دلانا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ نمازی بھول جاتا ہے، اور اسے یاد نہیں رہتا کہ اُس نے کتنی رکعتیں پڑھیں" (بخاری کتاب الصلواۃ ج ۱ ص۱۴۵)

شیطان کا اذان کی عربی عبارت سے گھبرانا اور پاد مارنا لیکن نماز کی لمبی چوڑی دعاؤں کی پروا نہ کرنا اور نمازی پہ سوار رہنا ایک ایسی منطق ہے، جو شاید کسی عقلمند کی سمجھ میں کبھی بھی نہ آئے۔ چلو مان لیتے ہیں کہ شیطان بلند آواز سے گھبراتا ہے اور اس لیے بھاگ نکلتا ہے۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ اگر نماز میں بھول صرف شیطانی تسلّط کی وجہ سے ہوتی ہے، تو آنحضرت صلعم کیوں بھول جایا کرتے تھے؟ بخاری باب الصلوٰۃ میں پوری چھ احادیث اس موضوع پر موجود ہیں۔ کہ حضورؐ فلاں فلاں نماز میں بھول گئے تھے۔ اور اس بھول کی تلافی سجدۂ سہو سے کی تھی۔ کیا شیطان رسول اللہ صلعم پہ بھی تسلط پا سکتا تھا؟

اسی طرح کی ایک اور حدیث سُنیئے:

"آنحضرتؐ کے سامنے کسی نے کہا۔ کہ فلاں شخص دن چڑھے تک سویا رہا۔ آپ نے فرمایا کہ شیطان اُس کے کانوں میں مُوت گیا تھا، اس لیے سویا رہا"

(بخاری ج ۲ صفحہ ۱۴۴)

لیکن اسی جلد کے سفحہ ۷۷ پر یہ روایت دی ہوئی ہے:

"عمران بن حصین کہتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ حضورؐ کے ہمسفر تھے۔ پچھلی رات تک ہم چلتے رہے۔ سحر کے قریب لیٹ گئے ۔ اور دیر تک سوتے رہے۔ یہاں تک کہ سورج کافی اوپر

آ گیا۔ سب سے پہلے حضرت صدیقؓ بیدار ہوئے۔ آپ نے حضورؐ کے سرہانے کھڑے ہو کر بلند آواز سے تکبیر کہنا شروع کر دی۔ چنانچہ آپ بیدار ہوئے اور نماز پڑھائی ......"

اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ کیا حضورؐ کے دن چڑھے تک سوتے رہنے کی وجہ بھی وہی تھی جو اوپر والی حدیث میں دی ہوئی ہے۔ تو بغیر اس کے کیا کہیں گے۔ کہ استغفر اللہ استغفر اللہ۔

تعظیم قبلہ

حضورؐ کا ارشاد ہے:

"جب تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کے لیے بیٹھے، تو وہ قبلہ کی طرف نہ منہ کرے۔ نہ پیٹھ۔"

(بخاری ج ۱ ص ۲۸)

اور یہ بھی ملاحظہ ہو:

"عبداللہؓ بن عمر کہتے ہیں۔ کہ میں حضرت حفصہ کے پاس والے مکان کی چھت پہ چڑھا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور صلعم قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے قضائے حاجت فرما رہے ہیں۔"

کس کو صحیح سمجھیں؟

کیا احرام میں شکار کا گوشت کھانا جائز ہے؟

"صعب بن جثامہ اللیثی کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کے پاس ایک گورخر بھیجا آپ نے لوٹا دیا۔ اور فرمایا کہ میں نے احرام باندھا ہوا ہے۔ ورنہ ضرور لے لیتا۔"

(مسلم ج ۳ صفحہ ۲۲۴ و ۲۲۵)

مطلب یہ کہ احرام میں شکار کا گوشت کھانا ناجائز ہے۔ اب دیکھیے یہ حدیث:

"سال حدیبیہ میں رسول اللہ صلعم کے ہمراہ ابو قتادہ بھی تھا۔ جس کے سوا باقی سب نے احرام باندھا ہوا تھا۔ اثنائے سفر میں ایک گورخر نظر آ گیا۔ ابو قتادہ سوار ہو کر اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ اور آخر اُسے برچھے سے مار لیا ذبح کر کے پکایا اور صحابہ کو پیش کیا۔ صحابہ نے حضورؐ سے پوچھا۔ کہ کیا ہم کھا لیں۔ فرمایا کھا لو۔ یہ حلال ہے"۔

(مسلم ج ۳ ص ۲۲۶)

یہی حدیث ذرا آگے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

"...... اور کچھ گوشت ہم حضورؐ کے پاس لے گئے۔ آپ نے خود تو نہ کھایا۔ لیکن صحابہ کو اجازت دے دی"۔

ذرا آگے اسی واقعہ کو یوں پیش کیا گیا ہے:

"...... رسول اللہ صلعم نے پوچھا کچھ باقی ہے؟ صحابہ نے کہا۔ صرف ایک ٹانگ باقی ہے۔ چنانچہ آپ نے وہ ٹانگ لی اور کھا گئے"۔

ایک ہی بات کو اتنی متضاد صورتوں میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا قیامت تک حقیقت کو نہ پا سکے۔

کیا احرام میں خوشبو لگانا جائز ہے؟

حضورؐ کا فرمان ہے:
" احرام میں ایسے کپڑے مت پہنو۔ جن پر زعفران یا کوئی اور خوشبو لگائی گئی ہو۔"
(مسلم ج ۳ صفحہ ۲۰۶)

" ایک آدمی خوشبودار جبّہ پہنے آپ کی خدمت میں آیا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ جبّہ دھو ڈالو۔ خوشبو کا اثر مٹا دو۔ اور پھر عمرہ کرو۔"
(مسلم ج ۳۔ صفحہ ۲۰۷)

قول جمہور یہی ہے کہ احرام میں خوشبو حرام ہے۔ لیکن حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کہ احرام باندھتے اور توڑتے وقت میں حضورؐ پہ خوشبو چھڑکا کرتی تھی۔" (مسلم ج ۳ صفحہ ۲۲۱)

حضرت عائشہؓ ہی کا قول ہے۔ کہ
" اس خوشبو میں مشک (کستوری) ڈال دیا کرتی تھی۔ اور احرام کی حالت میں اس تیل کی چمک حضورؐ کے بالوں میں دور سے نظر آتی تھی۔"
(مسلم ج ۳ صفحہ ۲۲۲)

مشک کی بو بہت تیز ہوتی ہے اور کافی دیر تک رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ تیل جو عین احرام کے وقت لگایا جاتا تھا۔ اس کی خوشبو دو چار روز تک بالوں میں یقیناً باقی رہتی ہوگی۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ احرام میں خوشبو لگانا جائز ہے یا ناجائز؟

شہد والا قصہ مشہور و اتعہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی ایک زوجۂ محترمہ کے ہاں جا کر شہد کھایا۔ چند دیگر ازواج نے سازش کر کے حضورؐ سے کہا۔ کہ آپ کے مُنہ سے بدبُو آتی ہے جس پر حضورؐ نے قسم کھا لی کہ میں آئندہ شہد نہیں کھاؤں گا اور معاً یہ آیت نازل ہوئی:

"اے رسول! آپ ایک حلال چیز کو کیوں حرام بنا رہے ہیں۔
کیا آپ بیویوں کو خوش کرنے کے لیے یہ کر رہے ہیں"؟

(قرآن)

اس واقعہ کو تجرید البخاری (ص ۸۵۶) کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ کہ حضورؐ نے حضرت زینب کے ہاں شہد کھایا تھا۔ اور حضرت عائشہؓ و حفصہؓ نے سازش کی تھی۔ لیکن ایک اور حدیث (تجرید البخاری ص ۸۱۲) میں بتایا گیا ہے۔ کہ شہد حضرت حفصہ کے ہاں کھایا گیا تھا اور سازش حضرت عائشہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت صفیہ نے کی تھی

یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ اس پر تہدید بھی نازل ہوئی۔ لیکن پھر بھی ہمارے راوی یہ نہ بتا سکے کہ حقیقت کیا تھی۔ کیا انہی روایات کو وحی کہا جاتا ہے؟

شقِ صدر کا واقعہ صفحات گذشتہ میں ہم حضرت انسؓ کی یہ روایت درج کر چکے ہیں۔ کہ کس طرح حضرت جبریلؑ نے رسول اللہ صلعم کا سینہ بچپن میں چیر کر دل کا وہ حصّہ کاٹ ڈالا تھا

جس پر شیطان کا تسلط ہوا کرتا ہے۔ اس واقعہ کے متعلق ابوذرؓ کہتے ہیں۔ کہ جبریل چھت پھاڑ کر گھر میں اتر آیا تھا۔ اور اس نے آپ کا سینہ چیرا تھا۔ (مسلم ج ۱۔ ص ۳۲۴) چھت پھاڑنے کی بھی خوب کہی ایک نوری مخلوق کہ جس کا نہ کوئی جسم ہے۔ نہ وزن۔ چھت پھاڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر بالفرض وزن و جسم تھا۔ تو کیا گھر میں داخل ہونے کے لیے کوئی دروازہ موجود نہیں تھا؟ سب کچھ تھا۔ لیکن جب تک ہمارے بزرگ داستان میں ڈرامائی رنگ نہ بھر لیں۔ انھیں تسلی نہیں ہوتی۔ اسی واقعہ کو مالک بن صعصعہؓ خواب کا واقعہ بتاتے ہیں۔ اور میرے خیال میں یہ صورت زیادہ قرین قیاس ہے۔

(مسلم ج ۱ ص ۳۲۴)

خیر النسا کون ہے؟

"ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ مردوں میں بڑے بڑے کامل انسان ہو گذرے ہیں۔ لیکن عورتوں میں آسیہ زوجۂ فرعون اور مریمؑ بنت عمران کے سوا کوئی اور عورت درجۂ کمال تک نہیں پہنچی اور یاد رکھو کہ جس طرح ثریدؔ[1] کھانوں کا سردار ہے۔ اسی طرح عائشہؓ تمام عورتوں کی سردار ہے۔" (بخاری ج ۲ ص ۱۶۱)

خلاصہ یہ کہ حضرت عائشہؓ خیر النسا ہیں۔ لیکن ایک اور حدیث میں مذکور ہے:

---

[1] ثرید۔ گوشت کا شوربہ جس میں روٹی گوندھ دی گئی ہو۔

"کہ اُمّت عیسےٰؑ کی بہترین عورت مریم تھی۔ اور میری اُمّت کی بہترین خدیجۃ الکبریٰ ہیں"

(بخاری ج ۲ صـ۱۶۴)

یعنی خدیجۃ الکبریٰ خیر النسا ہیں۔ ایک اور حدیث میں حضرت فاطمہؓ کو جنتی عورتوں کا سردار قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری ج دوم صـ۱۸۴۔ اب کیا سمجھیں کہ خیر النسا کون ہے ؟

انیسواں باب

چند دلچسپ احادیث

حدیث کا علم الافلاک

ا۔ سجدۂ آفتاب

جو لوگ دور و دراز ممالک میں سفر کرنے کے عادی ہیں۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ سورج غروب نہیں ہوتا۔ جب پاکستان میں سورج ڈوب جاتا ہے تو مصر میں لوگ شام کی چائے پی رہے ہوتے ہیں۔ اہل انگلستان دوپہر کا کھانا کھا رہے ہوتے ہیں۔ اور امریکہ کے بعض حصوں میں سورج نکل رہا ہوتا ہے۔ اگر آپ یہیں نہایت قابل اعتماد گھڑیاں ساتھ رکھ کر ایک طیارے میں ولایت چلے جائیں تو وہاں جا کر آپ حیران ہوں گے کہ جب یہ تمام گھڑیاں شام کے آٹھ بجا رہی ہوں گی۔ وہاں دن کا ڈیڑھ بج رہا ہو گا۔ اگر آپ ایک تیز رفتار راکٹ میں بیٹھ کر امریکہ چلے جائیں، تو یہ دیکھ کر آپ کی حیرت اور بڑھ جائے گی۔ کہ ان گھڑیوں کے مطابق سورج طلوع ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن وہاں ڈوب رہا ہو گا اگر انہی گھڑیوں کے ساتھ آپ جاپان کی طرف روانہ ہو جائیں تو پاکستانی وقت کے مطابق وہاں عین تین بجے بعد از دوپہر

سورج ڈوب رہا ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ رات کے ٹھیک بارہ بجے انگلینڈ میں شام کے ساڑھے پانچ بج رہے ہوں گے۔ اور جزائر ہوائی (HAWAI)[1] میں صبح کے ساڑھے پانچ۔

آج گھر گھر ریڈیو موجود ہے رات کے نو بجے ریڈیو کے پاس بیٹھ کر پہلے انگلستان لگائیے پھر ٹوکیو اور اس کے بعد امریکہ۔ آپ کو معاً یقین ہو جائے گا کہ زمین کا سایہ (رات) نصف دنیا پر ہے اور نصف دیگر پہ آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔

اِس حقیقت کی وضاحت کے بعد اب ذرا یہ حدیث دیکھیے!

"ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ غروبِ آفتاب کے بعد رسول اللہ صلعم نے مجھ سے پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو کہ غروب کے بعد آفتاب کہاں چلا جاتا ہے؟ میں نے کہا۔ اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ سورج بعد از غروب خدائی تخت (عرش) کے نیچے سجدے میں گر جاتا ہے۔ اور دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا ہے۔ چنانچہ اُسے مشرق سے دوبارہ نکلنے کی اجازت مِل جاتی ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اُسے اجازت نہیں ملے گی۔ اور حکم ہوگا کہ لوٹ جاؤ۔ جس طرف سے آئے ہو۔ چنانچہ وہ مغرب کی طرف سے نکلنا شروع کر دے گا۔ اور "الشمس تجری

---

[1] بحرالکاہل میں مجمع الجزائر۔ ٹوکیو سے ۳۴۶۹ میل دور مشرق کی طرف۔

لمستقر لہا" الخ کی تفسیر یہی ہے"۔ (بخاری ج ۲ ص ۱۳۵)
اگر ہم رات کے دس بجے پاکستانی ریڈیو سے دنیا کو یہ حدیث سنائیں اور کہیں کہ اس وقت سورج عرش کے نیچے سجدے میں پڑا ہوا ہے۔ تو ساری مغربی دنیا کھلکھلا کر ہنس دے۔ اور وہاں کے تمام مسلمان اسلام چھوڑ جائیں۔

۲۔ شیطان کا طول و عرض

کہتے ہیں کہ پیشانی طول جسم کا سولہواں حصہ ہوتی ہے انسان کا قد اوسطاً ۶۴ انچ ہوتا ہے۔ اور اس کی پیشانی چار انچ۔ باقی حیوانات میں بھی تقریباً یہی نسبت پائی جاتی ہے۔

ماہرین ارض و سما نے سالہا سال کی تحقیق و تلاش کے بعد اعلان کیا ہے کہ زمین کا محیط ۲۵ ہزار میل ہے۔ یعنی اگر ہم ۲۵ ہزار میل لمبا دھاگہ تیار کر کے زمین کے ارد گرد لپیٹ دیں، تو وہ بالکل پورا آجائے گا۔ سورج زمین سے بارہ لاکھ اسی ہزار گنا بڑا ہے۔ اور اس کا محیط تینتیس ارب پچاس کروڑ میل ہے۔

"ابن عمرؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں ...... کہ سورج نکلتے اور ڈوبتے وقت نماز نہ پڑھا کرو۔ اس لیے کہ سورج بوقت طلوع شیطان کے دو سینگوں میں ہوتا ہے"۔
(بخاری ج ۲ ص ۱۴۹)

سورج کی موٹائی ساڑھے تینتیس ارب میل ہے۔ اگر اتنی بڑی چیز

شیطان کے دو سینگوں میں سما جاتی ہے۔ اور ہم عرض کر چکے ہیں، کہ پیشانی طول جسم کا سولہواں حصّہ ہوتی ہے۔ تو شیطان کے جسم کی لمبائی پانچ کھرب بیس ارب میل ہونی چاہیئے۔ اور چوڑائی بھی اسی نسبت سے۔ اتنا بڑا شیطان کھڑا کہاں ہوتا ہوگا۔ زمین سے سورج نو کروڑ پینتیس لاکھ میل دور ہے۔ اور شیطان کی لمبائی سوا پانچ کھرب میل۔ اگر شیطان کو زمین پر کھڑا کیا جائے، تو سورج اس کے ٹخنوں سے بھی نیچے رہ جاتا ہے۔ اسے شیطان کے سینگوں تک پہنچانے کا کیا انتظام کیا جاتا ہے۔ اور اتنا بڑا شیطان زمین میں سماتا کیسے ہے؟

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زمین تقریباً گول ہے۔ اور زمین کے کسی نہ کسی حصے پہ ہر وقت سورج طلوع ہوتا رہتا ہے۔ یعنی اوقات مسلسل محوِ سفر رہتے ہیں۔ کلکتہ کی صبح چند لمحوں کے بعد بنارس پہنچتی ہے۔ پھر دہلی۔ پھر لاہور۔ پھر پشاور۔ پھر کابل۔ وعلیٰ ہذالقیاس۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج ہر وقت شیطان کے سینگوں کے درمیان رہتا ہے۔ چونکہ ایسی حالت میں نماز ناجائز ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو نماز بالکل ترک کر دینی چاہیئے۔

حدیث کا علم الجغرافیہ

حدیث کا علم الافلاک آپ پڑھ چکے اب یہ سنیئے کہ موسم کس طرح بدلتے ہیں۔ ہم اور آپ تو اتنا ہی جانتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ گرما میں ہم سورج کے قریب ہو جاتے ہیں اور سرما میں دور۔ اس لیے گرمی و سردی۔

محسوس کرتے ہیں۔ گرمی میں زمین کے فضا کی ذرّات گرم ہوجاتے ہیں اور چونکہ یہ ذرّات پہاڑوں پہ کم ہوتے ہیں۔ اِس لیے وہاں مقابلتہً ٹھنڈک ہوتی ہے۔ لیکن حدیث کہتی ہے:

"ابو ہریرہؓ آنحضرت صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جہنّم نے خدا کے پاس شکایت کی کہ میرا دم گھٹ چلا ہے۔ اِس لیے مجھے سانس لینے کی اجازت دیجیے۔ اللہ نے کہا کہ تم سال میں صرف دو سانس لے سکتے ہو۔ چنانچہ اس کی ایک سانس سے موسم گرما اور دوسری میں موسم سرما پیدا ہوگیا۔ لیکن دنیا کی گرمی و سردی سے جہنّم کی گرمی و سردی بہت زیادہ ہے۔"

(بخاری ج ۲ صفحہ ۱۴۳)

لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ ہر سال گرمیوں کے موسم میں صرف وہی علاقے اس سانس کی لپیٹ میں کیوں آتے ہیں۔ جو خط استوا کے قریب ہیں۔ اور سارا یورپ۔ سائبیریا۔ گرین لینڈ اور کینیڈا وغیرہ کیوں بچ جاتے ہیں؟ اور یہ بھی تو فرمایا ہوتا۔ کہ گرمیوں میں پہاڑوں پہ کیوں گرمی نہیں ہوتی؟ وہاں تک اس سانس کا اثر کیوں نہیں پہنچتا؟ اور سردیوں میں خطِ استوا کا علاقہ کیوں گرم رہتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ جہنّم نے زمین کو دو حصّوں میں بانٹ رکھا ہے۔ سردیوں میں وہ اہلِ یورپ کی خبر لیتا ہے اور گرمیوں میں ہماری۔ سچ ہے انصاف اچھی چیز ہے۔

ۓ کہتے ہیں کہ دوزخ کا ایک حصّہ سخت سرد اور دوسرا سخت گرم ہے۔

حدیث کا علم الطب:- ماہرینِ طب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ مکھی ایک نہایت خطرناک جانور ہے۔ جو مہلک امراض کے جراثیم ایک جسم سے دوسرے جسم تک منتقل کرتی رہتی ہے۔ تپِ دق کا مریض بازار میں تھوکتا ہے۔ تھوک پہ مکھیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ اپنے پروں اور ٹانگوں کے ساتھ لاکھوں زندہ جراثیم لے کر اڑ جاتی ہیں۔ کچھ حلوائی کی دکان پہ چلی جاتی ہیں اور کچھ گھروں میں داخل ہو کر اشیائے خوردنی پہ آ بیٹھتی ہیں۔ اور کھانے والا ان امراض کا شکار بن جاتا ہے۔ یہ ہیضہ، یہ دق، یہ پیچش، یہ تپِ محرقہ اور بیسیوں دیگر امراض مکھیوں کی مہربانی کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے علمائے صحت نے ہمیں سخت تاکید کر رکھی ہے۔ کہ اشیائے خوردنی کو مکھیوں سے بچاؤ جس چیز پہ مکھی بیٹھ جائے، اُسے ہرگز نہ کھاؤ۔ اور مکھیوں کو تباہ کرنے کے لیے فلاں فلاں وسائل سے کام لو۔ لیکن حدیث کہتی ہے:

اذا وقع الذباب فی شراب احدکم فلیغمسہ ثم لینزعہ فان فی احدی جناحیہ داء و فی الاخری شفاء	اگر مکھی شربت وغیرہ میں گر جائے تو اُسے پوری طرح غوطہ دے کر باہر نکالو اسلئے کہ اس کے ایک پر میں بیماری ہوتی ہے اور دوسرے میں شفا۔

(بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۴۸)

مکھی بیت الخلا سے اُڑ کر آتی ہے۔ پر اور ٹانگیں غلاظت سے لتھڑی ہوتی ہیں۔ اور مولانا اس کے دوسرے پر میں شفا تلاش کر رہے ہیں۔

حدیث کا علم التولید رحم مادر میں بچہ کیسے بنتا ہے۔ نر و مادہ کی علامات اس میں کس منزل پر کس طرح پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ماں یا باپ یا دونوں کے خد و خال کس طرح حاصل کر لیتا ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہ فطرت کے وہ رموز ہیں جنھیں کوئی ماہر فطرت آج تک نہیں سمجھ سکا۔ لیکن ہمارے علما ان مسائل کو صدیوں پہلے حل کر چکے ہیں:

"مرد کا نطفہ سفید ہوتا ہے، اور عورت کا زرد۔ انزال کے بعد یہ ہر دو قسم کے نطفے مل جاتے ہیں۔ اگر مرد کا نطفہ غالب آجائے۔ یعنی یہ مرکب مائل بہ سفیدی ہو تو اللہ کے حکم سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ بچی۔" (مسلم ج ۱ صفحہ ۱۶۵)

ماہرین تولید اس امر پر متفق ہیں، کہ عورت کا نطفہ مقدار میں بیحد کم یعنی بہ مشکل ایک آدھ قطرہ ہوتا ہے، اور مرد کا کافی زیادہ۔ اگر ان دونوں کو ملا دیا جائے تو عورت کا نطفہ نظر تک نہ آئے۔ چہ جائیکہ وہ نطفۂ شوہر کا رنگ بدلتا پھرے۔ اس صورت میں چاہیئے تو یہ تھا کہ مجامعت سے ہمیشہ لڑکا پیدا ہوتا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ لڑکیاں زیادہ پیدا ہو رہی ہیں، اور لڑکے کم۔

علمائے جدید نے واضح کیا ہے کہ بچہ دانی کے عین سامنے ایک باریک سا خوردبینی انڈا منتظر رہتا ہے۔ جونہی مجامعت کے وقت مرد کے نطفہ کا کوئی قطرہ اس سے چھو جاتا ہے، تو یہ دونوں ایک

دوسرے کو مضبوط پکڑ لیتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ سرک کر رحم کے اندر چلے جاتے ہیں۔ رحم کا منہ بند ہو جاتا ہے۔ اور تکوینِ جنین کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تولید کے لیے نطفے کا صرف ایک مہین سا ذرہ استعمال ہوتا ہے۔ اور باقی بہہ کر باہر آجاتا ہے۔ بس یہ ہے داستانِ تولید۔

خدّ و خال کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

"مجامعت کے وقت اگر مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو، تو بچہ باپ پہ جاتا ہے، ورنہ ماں پر" (بخاری ج ۲ صـ۱۴۹)

داد دیجیے اس مُلّا کو کہ فطرت کے ایک نہایت مخفی راز کو کس بے تکلفی، صفائی اور آسانی سے بے حجاب کر دیا ہے۔ اب یورپ ہمیں یہ طعنہ تو نہیں دے گا۔ کہ مسلمان کائنات پہ غور نہیں کیا کرتے۔ اور کہ وہ جاہل نااہل اور نالائق ہیں۔ ذرا پیش تو کرے ہمارے اس ریسرچ کے مقابلے میں کوئی اپنی تحقیق

میں لایا ہوں پکڑ کر شیرِ تحقیق
تم اپنے فیلِ معنی کو نکالو!

اگر آپ چاہتے ہیں۔ کہ آپ کے ہاں ایسی اولاد پیدا ہو جو فرشتوں سے زیادہ پاکیزہ اور ابلیس کی زد سے بالکل باہر ہو۔ تو لیجیے نسخہ حاضر ہے:

"ابن عباسؓ حضور سے روایت کرتے ہیں، کہ جب کوئی شخص

مجامعت کرنے لگے تو یہ دعا پڑھ لے بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ جنبنا الشیطان وجنب الشیطان ما رزقنا (اے اللہ! مجھے اور میری اولاد کو شیطان سے بچا) اس کی اولاد کو شیطان کبھی گمراہ نہیں کر سکے گا۔" (بخاری ج ۲ ص ۱۴۷)

کتنی امرت دھارا قسم کی دعا ہے۔ کہ نہ قرآن کی ضرورت باقی رہی اور نہ رسول کی۔ اس لیے کہ قرآن و رسول کا کام تو ہدایت ہے اور جس بچے کے گمراہ ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہا۔ قرآن و رسول اُس کے کس کام کے؟

حدیث کا علم الصّوت مرغ کیوں بانگ دیتا ہے۔ گدھا کیوں ہینگتا ہے۔ گھوڑا کیوں ہنہناتا ہے۔ شیر کیوں دھاڑتا ہے اور ہاتھی کیوں چنگھاڑتا ہے؟ ان تمام سوالات کا حل تو مشکل ہے۔ البتہ ایک دو سوالات کے جوابات حاضر ہیں:

"ابوہریرہؓ رسول اللہ صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ جب تم مُرغ کی صدا سنو تو اللہ سے فضل کی دعا مانگا کرو۔ اس لیے کہ اُس وقت مرغ کو فرشتہ نظر آیا کرتا ہے۔ اور جب گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے پناہ مانگو۔ اس لیے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر ہینگتا ہے۔" (بخاری ج ۲ ص ۱۴۷)

ع حقیقت خرافات میں کھو گئی

حدیث کا علم الآداب

اگر کوئی شخص کسی محفل میں جا کر تین مرتبہ سلام کرے۔ اور ہر بات کو تین تین مرتبہ دُہرائے تو آپ اُسے کب تک برداشت کریں گے ؟

عن انس عن النبی صلعم انہ کان اذا سلّم سلّم ثلاثاً واذا تکلّم بکلمۃٍ اعادھا ثلاثاً۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کی یہ عادت تھی کہ وہ تین مرتبہ سلام کہتے۔ اور ہر بات کو تین تین مرتبہ دہراتے تھے

(بخاری ج ۱ صـ۲۰)

حضور علیہ السّلام کے بے شمار اقوال وخطبات ہمارے سامنے موجود ہیں کہیں بھی کسی بات کو تین تین مرتبہ دُہرایا نہیں گیا۔ ہاں اگر کسی نے دو چار مرتبہ ایک ہی سوال پوچھا ہو تو آپ نے ایک ہی جواب اتنی ہی مرتبہ دُہرا دیا ہوگا۔ ورنہ ہمارے رہبر فطرتِ انسانی کے بہت بڑے ماہر اور مزاج شناس تھے۔ وہ افصح العرب والعجم تھے۔ انھیں یہ چھوٹی سی بات یقیناً معلوم ہوگی۔ کہ تکرار تنافر پیدا کرتا ہے۔ اور کلام کو درجۂ فصاحت سے گرا دیتا ہے۔

ایک اور حدیث سُنیے :

,, حذیفہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السّلام کھاد کے ایک ڈھیر کے قریب آئے اور کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا۔ ،،

(بخاری ج ۱ صـ۳۶)

اِس حدیث کو بخاری اور مسلم نے دو دو مرتبہ دہرایا ہے لیکن امام مالکؒ

نے اسے بیان نہیں کیا۔ اُنھوں نے یہ بات حضرت عبداللہ بن عمرو کی طرف منسوب کی ہے۔ فرماتے ہیں:

عن عبد اللّٰہ بن دینار قال رایت عبد اللّٰہ بن عمر یبول قائماً۔ (موطا صـ۲۲)

عبداللہ بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن عمر کو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا۔

حدیث کا علم السنہ

اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ سعدی نے گلستان سات بولیوں یا زبانوں میں لکھی تھی۔ تو آپ کیا سمجھیں گے؟ یہی کہ اُنھوں نے گلستاں کے سات نسخے تیار کیے تھے۔ ایک فارسی میں۔ دوسرا عربی۔ تیسرا انگریزی میں۔ چوتھا جرمنی میں۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ لیکن اگر کوئی شخص فارسی کی گلستاں کے متعلق یہ کہے کہ یہ سات زبانوں میں لکھی ہوئی ہے۔ تو آپ اسے یہی کہیں گے کہ سر پہ ٹھنڈا پانی ڈال لو۔ تاکہ حواس درست ہو جائیں۔

"اُبیّ بن کعب کہتے ہیں کہ مسجد میں دو آدمیوں نے ایک ہی آیت کو مختلف طور پر پڑھا۔ اور مجھے کچھ اور طرح یاد تھی۔ ہم سب رسول اللہ صلعم کے پاس گئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ دونوں درست پڑھ رہے ہیں۔ یہ سُن کر مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ میں اسلام چھوڑنے کو تیار ہو گیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ قرآن سات بولیوں میں اُتارا گیا ہے۔

(ملخص مسلم ج ۲ ۔ صـ۳۶۳)

کیا سات بولیوں میں اُتارنے کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ہی آیت سات مختلف بولیوں میں اُتری تھی۔ تو پھر وہ باقی چھ بولیوں کے قرآن کہاں چلے گئے۔ اگر مراد یہ ہے کہ ایک آیت قریش کی بولی میں اُتری تھی، دوسری ہذیل کی اور تیسری ازد کی بولی میں۔ تو پھر ایک ہی آیت کے متعلق ان تین صحابہ کی مختلف قرأتوں کو حضورؐ نے درست کیوں قرار دیا؟

تدوین قرآن کی تاریخ بتلاتی ہے کہ حضورؐ پہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی۔ تو آپ قرآن میں اُس کی صحیح جگہ فوراً متعین کر دیتے تھے۔ کاتب الوحی کو ہدایت ہوتی تھی۔ کہ اسے لکھ کر مناسب جگہ پہ رکھ دو۔ اور حفاظ کو ارشاد ہوتا تھا۔ کہ اسے فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد پڑھو۔ سینکڑوں حفاظ نے حضورؐ کی مقرر کردہ ترتیب کے مطابق قرآن یاد کر لیا تھا۔ اور ایک نسخہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں موجود تھا۔ جو چمڑے کے ٹکڑوں، پتھروں اور پتوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا جب حضرت صدیقؓ کے زمانے میں حفاظ قرآن کی ایک خاصی تعداد جنگِ یمامہ میں شہید ہو گئی۔ تو آپ نے نسخۂ رسولؐ سے ایک نسخہ نیا تیار کرایا۔ جو حضرت حفصہؓ کے ہاں رکھ دیا گیا۔ جب حضرت عمرؓ کو اپنے عہد میں یہ شکایت پہنچی کہ سلطنت کے دُور و دراز علاقوں (مثلاً عراق و عجم وغیرہ) میں بعض آیاتِ قرآن میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ تو آپ نے حضرت حفصہؓ سے وہ نسخہ منگوا کر کئی نقول تیار کرائیں اور سلطنت کے

مختلف حصوں میں بھیج دیں۔

سوال یہ ہے۔ کہ کیا حضورؐ کے اپنے نسخے میں ہر آیت سات سات بولیوں میں لکھی ہوئی تھی۔ اگر تھی تو صدیقؓ و فاروقؓ نے اس کی صحیح نقل ہم تک کیوں نہ پہنچائی۔ اگر نہیں تھی تو اس حدیث کا مطلب ؟ آیۂ وضو میں صرف ایک اختلاف کی بنا پر کسی نے "اَرْجُلَکُمْ"[1] کو "اَرْجُلِکُمْ" پڑھ دیا۔ پورا ایک فرقہ پیدا ہو گیا۔ جو وضو میں پاؤں پہ مسح کرتا ہے۔ اگر قرآن میں اس قسم کے اختلافات کی اجازت دے دی جاتی، تو ہر مسلمان کا مذہب دوسرے سے جدا ہو جائے۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ اس حدیث کے تراشنے کا مقصد بھی مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنا۔ اور قرآن کو ناقابل اعتماد بنانا تھا۔ اگر اس حدیث کا مطلب یہ لیا جائے کہ یہ اختلاف صرف قرأت تک محدود تھا۔ جیسے کہ ہم "سکول" کہتے ہیں اور یو۔ پی والے "اِسکول"۔ تو پھر حدیث کا مفہوم واضح ہے۔ لیکن ستم تو یہی ہے۔ کہ بعض ایسی آیات بھی اس باب میں درج ہیں جن کے الفاظ مختلف ہیں۔

حدیث کا علم النباتات

"جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مسجد نبوی میں ایک درخت تھا جس کے پاس کھڑے ہو کر جمعہ کے دن حضورؐ وعظ فرمایا کرتے تھے انصار

[1] اگر "ارجلکم" کو بفتح لام پڑھیں تو تفسیر ہو گی "پاؤں کو دھوؤ"۔ اور بکسر لام پڑھیں تو معنی ہوں گے "پاؤں پہ مسح کرو"۔ اور اسی لیے شیعہ حضرات مسح کیا کرتے ہیں۔

میں سے ایک مرد یا عورت نے منبر کی تجویز کی۔ آپ نے فرمایا جیسے تمہاری مرضی۔ پھر جس روز منبر تیار ہو گیا اور آپ منبر پر چڑھ کر وعظ کہنے لگے، تو اُس تنے نے ایک بچے کی طرح رونا شروع کر دیا۔ حضورؐ منبر سے اترے اور اُس درخت کو باہوں میں لے کر چپ کرایا ..... ۔" (بخاری ج ۲ ص ۱۶۹)

حضورؐ مکہ سے نکلے، تو اُن کا نہ گھر رویا۔ نہ درخت نہ کوئی پتھر۔ آپ زندگی میں ہزار ہا درختوں کے نیچے بیٹھے ہوں گے۔ لیکن کوئی درخت کبھی نہ رویا۔ پھر اس مسجد والے درخت کو کیا خاص صدمہ پہنچا تھا کہ وہ رونے لگا۔ حالانکہ حضورؐ صرف دو قدم کے فاصلے پہ موجود تھے۔

رونے کے لیے احساس۔ دِل۔ دماغ۔ پھیپھڑوں گلے اور دقیق نظامِ جسمانی کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ اُس درخت میں کہاں سے آ گیا تھا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ یہ معجزہ تھا۔ تو پھر رسول اللہ صلعم نے کفار کو معجزہ دکھانے سے کیوں انکار کر دیا تھا۔ اور صاف صاف کہہ دیا تھا۔

هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا (قرآن) — مَیں ایک انسان ہوں جس کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا ہے نہ کہ معجزے دکھانا۔

اور مسلمانوں کے سامنے معجزہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو پہلے ہی ایمان لا چکے تھے؟

حدیث کا علم الحقائق

"ام شریک راوی ہیں کہ حضورؐ نے سانڈھے کو مارنے کا حکم دیا تھا۔

اِس لیے کہ یہ اُس آگ کو پھونکوں سے بھڑکاتا تھا، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو پھینکا گیا تھا۔" (بخاری ج ۲ صـ۱۵۳)

بھلا حضرت ابراہیمؑ نے سانڈھے کا کیا بگاڑا تھا؟ اور اس آگ کو جس میں ساٹھ ستر من ایندھن جل رہا تھا۔ ایک ننھا سا کیڑا کیا بھڑکا سکتا تھا؟ اور اس کے تنفّس میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ وہ آگ کے شعلوں میں ذرّہ بھر بھی اضافہ کر سکتا؟

کہاں تک گنوں صاحب! بات لمبی ہو رہی ہے۔ ورنہ صحاحِ ستّہ میں اس نوع کی سینکڑوں اور احادیث موجود ہیں۔ جن کی نسبت اُس معلّمِ اخلاق و تہذیب کی طرف خدا و رسول ہر دو کے لیے باعثِ توہین ہے۔ میرا مقصد احادیث پہ تنقید نہیں۔ بلکہ یہ دکھانا ہے کہ احادیث کے جن مجموعوں کو "صحیح" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُن میں بھی ایسے ایسے اقوال بھرے پڑے ہیں۔ جنھیں سُن کر تہذیب کانوں پہ ہاتھ دھرے۔ عقلِ سلیم بلبلا اُٹھے۔ اور کتابِ الٰہی کلیجہ تھام کے رہ جائے۔ نمونہ آپ نے دیکھ لیا۔ انصافاً کہیئے کہ ان اقوال کو وحی سمجھ کر ان پہ کیسے عمل کریں۔ اور اُس دستور العمل کو کیسے چھوڑ دیں۔ جس کی ہر ہدایت روشن۔ ہر لفظ حقیقت۔ ہر حرف صداقت۔ ہر حکم دینی و اُخروی فلاح کا ضامن۔ اور ہر قول تمام شبہات سے وارء الورا ہے۔ ہم نے قرآن کی ہر بات کو سائنس[1] کی کسوٹی پہ پرکھا۔ فطرت کی میزان میں تولا۔ اور

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب "دو قرآن" مطبوعہ کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور

اعمال خدا سے اس کا مقابلہ کر کے دیکھا۔ ہمیں ہر جگہ صرف حقیقت اور ٹھوس حقیقت نظر آئی۔ تاریخ نے بارہا اس دستور العمل کا تجربہ کیا۔ اور ہر مرتبہ اسے تابدار کامرانی نصیب ہوئی۔ اسے بارہا چھوڑا اور ہر بار اسے مہیب شکست و ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔ قرآن حقائق سے بحث کرتا ہے اور حدیث اوہام کی طرف دعوت دیتی ہے۔ حقیقت کو چھوڑ کر ہم سراب کی طرف کیوں بھاگیں۔

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست ۔۔۔ زیرِ گردوں رازِ تمکینِ تو چیست

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ۔۔۔ حکمتِ اولا یزال است و قدیم

از یک آئینی مسلماں زندہ است

پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است

(اقبالؒ)

بیسواں باب

صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا

صفحاتِ گذشتہ میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ بوجوہاتِ ذیل صحیح احادیث کا سراغ لگانا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

(۱) خلفائے راشدین احادیث کو ڈھونڈ کر جلاتے رہے۔

(۲) حضورؐ نے کتابتِ احادیث سے منع فرما دیا تھا۔

(۳) اڑھائی سو برس تک احادیث ہر کہ و مہ کی زبان پر جاری ہیں اور بگڑتے بگڑتے خدا جانے کیا سے کیا بن گئیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ کوئی حدیث موجود ہی نہیں۔ "صحیح حدیث" کے دو مفہوم ہیں۔ اول یہ کہ کسی حدیث کی نسبت آنحضرت صلعم کی طرف صحیح ہو۔ یعنی ہم بہ دلائل ثابت کر سکیں۔ کہ یہ قول حضورؐ کی زبانِ مبارک سے واقعی نکلا تھا ان معنوں میں کوئی حدیث یقینی طور پر صحیح نہیں۔ البتہ ظنِ غالب یہ ہے کہ بعض اقوال صحیح ہوں گے۔ دوم کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو۔ اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں۔

اِس صورت میں ہمیں صرف یہ دیکھنا پڑے گا۔ کہ حدیث قرآن سے تو نہیں ٹکراتی۔ حضورؐ یا صحابہ کرام کی توہین تو نہیں کرتی تعلیماتِ قرآن کا مضحکہ تو نہیں اڑاتی۔ تاریخ کے مسلّمہ واقعات کے خلاف تو نہیں جاتی۔ انسانی فطرت اور حقائق کونیہ کو تو نہیں جھٹلاتی۔ اُمّت کو گرفتارِ اوہام تو نہیں بناتی۔ اور قرآن کی قطعیت پہ حملہ تو نہیں کرتی۔ پس ہر ایسی حدیث صحیح ہے۔ خواہ اُس کا راوی ابوہریرہؓ ہو یا بابا رتن۔ ہمارے محدّثین اسناد و روایت پہ تکیہ کرتے رہے۔ اور انھیں کرنا بھی چاہیئے تھا۔ آخر کسی قول کو آنحضرت کی طرف منسوب کرنے کے لیے روایت کا سلسلہ ضروری تھا۔ لیکن آج ہمیں صرف مضمونِ حدیث کو دیکھنا چاہیئے۔ اگر کوئی بات قرآن کے مطابق ہو، تو اُسے تسلیم نہ کرنا گویا قرآن سے انکار کرنا ہے۔ اگر کوئی انگریز کہہ دے کہ خدا ایک ہے۔ چوری۔ زنا۔ اور قمار بازی گناہ ہیں۔ تو کیا کسی مسلمان میں یہ جرأت ہے۔ کہ وہ ان اقوال کے صحیح ہونے سے انکار کرے۔ گو یہ اقوال انگریز کے منہ سے نکل رہے ہیں۔ لیکن قرآن کی آیات کے لفظی تراجم ہیں۔ ان کو نہ ماننا گویا اپنی کتاب کو جھٹلانا ہے اس طرح کی ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں۔ جو نہ صرف تعلیماتِ قرآن کے عین مطابق ہیں۔ بلکہ وہ آنحضرت صلعم کی حیاتِ مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔ صحابۂ کرام کی جراءت۔ شجاعت۔ ایثار۔ سرفروشی۔ خدمتِ خلق۔ حرارتِ ایمانی۔ عشقِ رسولؐ۔ تقویٰ اور نظم و ضبط کی حیات انگیز

داستانیں سناتی ہیں۔ اُس عہد کے تمدّن پر مکمل روشنی ڈالتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ اسلام کی حیرت انگیز ترقی کے اسباب کیا تھے؟ اکاسرہ کیوں مٹ گئے؟ قیاصرہ کو کیوں شکست ہوئی؟ مٹھی بھر مسلمان سندھ کے ریگستان سے فرانس کی عشرت گاہوں تک کیسے چھا گئے؟ لیٹرے فرمانروا کیسے بن گئے؟ گڈریئے اورنگِ جہانبانی پہ کیسے جا بیٹھے؟ وحشی فلسفہ وحکمت کا درس کیسے دینے لگے؟ شرابیوں اور جواریوں میں اس بلا کی پاکیزگی کہاں سے آ گئی؟ ۳۶۰ بتوں کے پجاری ایک خدا، ایک قبلہ، ایک مرکز، اور ایک نصب العین کے تخیل پہ کیسے متحد ہو گئے؟ یہ تمام تفاصیل حدیث میں ملتی ہیں۔ اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے جس پہ ہم نازاں ہیں۔ اور جس سے اب تک کروڑوں غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں۔ مولانا شبلی کے "الفاروق" کا ماخذ یہی احادیث تھیں۔ اور یہ وہ کتاب عظیم ہے۔ جو اس وقت تک لاکھوں کیرکٹر (کردار) بنا چکی ہے۔ اگر عہدِ رسول کے ایک فرد کی سیرت اس قدر انقلاب پیدا کر سکتی ہے تو اندازہ لگائیے کہ اگر احادیث کے تمام کردار اسی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کر دیئے جائیں۔ تو نتائج کس قدر حیرت انگیز ہو سکتے ہیں۔

وحیِ خفی کا مسئلہ ہم صفحاتِ گذشتہ میں کئی آیات سے واضح کر چکے ہیں۔ کہ حضورؐ پر بذریعہ وحی صرف قرآن نازل ہوا تھا۔ اور آپ کا کوئی اور قول وحی کا درجہ نہیں رکھتا۔ چونکہ قرآن میں صرف مہماتِ مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اور چھوٹی موٹی تفاصیل کو

انسانی عقل پہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اِس لیے حضورؐ تمام غیرالہامی مسائل میں صحابہ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ حضورؐ کی ہر حرکت۔ ہر قول اور ہر اقدام تابع وحی ہوا کرتا ہے۔ تو پھر "شَاوِرْهُم" (تم صحابہ سے مشورہ کرلیا کرو) کی ہدایت بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے اسلیے کہ وحی (خدائی ہدایت) کے متعلق مشورہ لینا خدا کی توہین ہے مشورے میں موافق و مخالف دونوں قسم کی آزادی جاتی ہیں۔ اور کسی صحابی میں یہ ہمّت کہاں کہ وہ خدائی ہدایت کی موجودگی میں اپنی رائے کا اظہار کرتا احادیث میں کئی ایسے واقعات موجود ہیں۔ کہ حضورؐ نے کچھ کہا۔ صحابہ نے کچھ اور مشورہ دیا۔ اور وحی نے صحابہ کی تائید کردی۔ اسیرانِ بدر کا واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ کہ حضورؐ نے فدیہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ حضرت فاروقؓ نے قتل کا مشورہ دیا۔ اور اللہ نے حضرت عمرؓ کی تائید فرمادی۔ اگر حضورؐ کا ہر قول یا ہر فیصلہ وحی ہوتا تو حضورؐ مشورہ کیوں لیتے؟ صحابہ فیصلہ رسول کے خلاف رائے کیسے دیتے؟ اور پھر قرآن صحابہ کی تائید کیوں کرتا؟ یہ ناممکن ہے کہ اللہ پہلے تو اسیرانِ بدر سے فدیہ لینے کی وحی نازل کرتا۔ اور دو منٹ بعد حضورؐ سے جواب طلب کرتا کہ تم نے فدیہ کیوں لیا ہے۔

ہم عرض کرچکے ہیں کہ اللہ نے قرآن میں صرف اہم قوانین و ضوابط سے بحث کی ہے۔ اور غیر اہم مسائل انسانی اجتہاد پہ چھوڑ دیئے ہیں۔ آنحضرت صلعم تمام ایسے معاملات میں اجتہاد سے کام لیا کرتے تھے اور احادیث کا بیشتر حصّہ انہی اجتہادات پہ مشتمل ہے۔ یہ فرض کرلینا کہ رسول اللہ

صلعم ملکۂ اجتہاد سے عاری تھے۔ اور وحی کے بغیر نہ کچھ سوچ سکتے تھے، اور نہ کر سکتے تھے۔ رسالت پناہ کی توہین ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کے متعلق یہ کہہ دے کہ آپ ہر معاملہ میں اپنے کسی دوست یا بیوی کے مشورے پہ چلتے ہیں، تو کیا آپ اسے اپنی توہین نہیں سمجھیں گے؟

آج سے چند سال پہلے کسی کالج میں مجھے ایک ایسے پروفیسر کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ جو نہایت زندہ دل، مخلص، شریف اور بے غرض دوست تھے۔ اور میری ہمسایگی میں رہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی وہ مجھ سے بگڑ جاتے۔ اور مہینوں کھچے رہتے۔ ٹوہ لگانے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ دنیا کے ہر معاملے میں رفیقۂ حیات کی ہدایات پہ چلتے تھے۔ اگر وہ فرما دیتیں کہ برقی سے علیحدہ ہو جاؤ۔ تو وہ مجھ سے بگڑ جاتے۔ اور اگر صلح کا حکم دے دیتیں تو کسی رسمی تکلف کے بغیر سیدھے میرے پاس چلے آتے۔

ہمارے علما نے بھی سرورِ کائنات کے متعلق کچھ اسی قسم کا تصور قائم کر رکھا ہے کہ اُن کا ہر قول وحی تھا۔ یعنی روٹی مانگتے (آخر یہ بھی قول ہے) تو وحی کا انتظار کرتے۔ اگر یہ پوچھنا ہوتا۔ کہ "میرا دوسرا جوتا کہاں ہے؟" تو جبریلؑ کی راہ دیکھتے رہتے۔ کہ وہ آئے۔ میرے لیے فقرہ تجویز کرے اور میں بولوں۔

تاریخِ رسالت کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ کئی ماہ تک وحی کا سلسلہ بند رہا اور کفار نے استہزاءً کہنا شروع کر دیا تھا۔ "لو جی! آپ کی پیغمبری

ختم ہو گئی ہے"۔ آخر چھ ماہ کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں
وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی ...... الخ

اور آنحضرتؐ کی پریشانی ختم ہوئی۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں حضورؐ نے کوئی بات تو کی ہو گی؟ سوال یہ ہے کہ آیا وہ قول وحی تھا یا نہیں؟ اگر تھا تو دریافت طلب امر یہ ہے۔ کہ وحی کا سلسلہ تو مسدود تھا وہ قول وحی کیسے بن گیا؟ کیا جبریلؑ رات کو چھپ کر چھپکے چھپکے آجاتا تھا۔ اور اللہ کو (نعوذ باللہ) خبر نہیں ہونے پاتی تھی؟ (ممکن ہے وحی خفی کا مفہوم یہی ہو) اور اگر وحی نہیں تھا۔ تو گویا آپ بھی یہ تسلیم کرنے پہ مجبور ہو گئے۔ کہ حضورؐ کی ہر بات وحی کا نتیجہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ اور یہی چیز ہم کہہ رہے ہیں۔ کہ قرآن کے سوا حضورؐ کو کوئی اور چیز بذریعہ وحی نہیں دی گئی تھی۔

اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ۔ (قرآن) تمھیں گناہوں سے بچانے کے لیے مجھے بذریعہ وحی یہ قرآن دیا گیا ہے۔

اس مضمون پر ایک مشتبہ سی حدیث بھی ملتی ہے۔

"ابو جحیفہ نے حضرت علیؓ سے پوچھا۔ کہ آپ کے پاس قرآن کے سوا کوئی اور وحی موجود ہے؟ فرمایا۔ خدا کی قسم اس صحیفے کے سوا اور اس فہم کے بغیر جو وحی کے متعلق ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ ہمارے پاس کوئی اور وحی موجود نہیں"۔

(بخاری ج ۲ ص ۱۱)

میں نے اس حدیث کو مشتبہ اس لیے کہا۔ کہ اس میں حضرت علیؓ قرآن کے سوا ایک اور صحیفہ کو بھی الہامی سمجھتے ہیں۔ نسائی میں اس صحیفہ کی تفصیل یہ دی ہوئی ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے اہل بیت کے لیئے چند خاص وصایا ارشاد فرمائی تھیں۔ جو اس صحیفہ میں درج تھیں۔ اور جسے حضرت علی رض نیام ذوالفقار میں رکھا کرتے تھے۔ علّامہ صنعانی کہتے ہیں۔ کہ یہ وصایا جعلی تھیں۔ اور ان کا واضع حماد بن عمرو النصیبی تھا۔ سیوطی فرماتے ہیں۔ کہ بعض وصایا عبداللہ بن زیاد بن سمعان نے تراشی تھیں۔ (تذکرۃ للموضوعات ص)

بہرحال اس حدیث سے اتنا تو واضح ہو گیا۔ کہ قرآن اور اس فرضی صحیفے کے سوا کوئی اور وحی موجود نہیں تھی۔ اس لیے احادیث کو وحی خفی کہنا نہ عقلاً درست ہے۔ اور نہ نقلاً۔

ایک سلیم الفطرت مسلمان کا وتیرہ یہ ہونا چاہیئے۔ کہ وہ ہر ایسی حدیث کو تسلیم کرے۔ جو قرآن کے متعارض نہ ہو۔ خواہ وہ بخاری میں ہو، یا کسی مسند میں۔ اور ہر ایسی حدیث کو بلا دریغ ٹھکرا دے۔ خواہ وہ بخاری ہی میں درج ہو۔ جو

(۱) تعلیمات قرآن کے منافی ہو۔
(۲) قرآن میں تحریف تسلیم کرتی ہو۔
(۳) رسول اکرمؐ۔ ازواج مطہرات۔ اور صحابۂ کرام کی توہین کرتی ہو۔
(۴) حقائق کونیہ کے خلاف ہو۔
(۵) انسانی فطرت کو جھٹلاتی ہو۔

(۶) عقل، تجربہ اور مشاہدہ کے اُلٹ ہو۔
(۷) مسلّمہ تاریخی واقعات کی تردید کرتی ہو۔
(۸) اسلام کے اہم اصولوں مثلاً جہاد و ایثار وغیرہ کی منزلت گھٹاتی ہو۔
(۹) رہبانیت اور نفس کشی کو جہاد اکبر قرار دیتی ہو۔
(۱۰) مسلمان کو دنیا سے بیزار کرتی ہو۔
(۱۱) ایک ایک دعا پر لاکھوں محل تقسیم کرتی ہو۔
(۱۲) وضو کرنے پر سارے گناہ معاف کرتی ہو۔
(۱۳) دوات کی سیاہی کو ایک لاکھ شہیدوں کے خون سے افضل ٹھہراتی ہو۔
(۱۴) ذکرِ خدا کو جان و مال کی قربانی سے بہتر قرار دیتی ہو۔
(۱۵) سورج کو عرش کے نیچے سجدہ کراتی ہو۔
(۱۶) درختوں کو رُلاتی ہو۔
(۱۷) صوم و حیض میں مباشرت کی اجازت دیتی ہو۔
(۱۸) طریقت اور پیر گردی کو اُچھالتی ہو۔
(۱۹) صرف کلمہ پڑھنے پہ زانی اور چور تک کو جنّت میں بھیجتی ہو۔
(۲۰) سورج کو شیطان کے سینگوں میں پھنساتی ہو۔
اور جو قرآن کے مشکل اسلام کو چھوڑ کر مُلاؤں کے آسان اِسلام کی طرف دعوت دیتی ہو۔

آج دنیائے اسلام قرآن کے ہیبت و قوت والے اسلام سے کٹ کر حدیث کے تسبیحوں۔ دعاؤں۔ چلّوں۔ وظیفوں۔ جنتروں اور منتروں والے اسلام میں آ پھنسی ہے۔ ہمارے ائمہ مساجد ہر مسجد میں اور ہمارے واعظین دیہات میں پھر پھر کر۔ دعاؤں۔ ڈھیلوں۔ لاکھ لاکھ حجوں۔ بہشتوں اور مفت حوروں والی احادیث سُنا کر سارے عالم اسلام کو اپنے رنگ میں رنگ چکے ہیں۔ جسے دیکھو مزاروں پہ ماتھا رگڑ رہا ہے۔ کسی پیر کے دام ہمرنگِ زمین میں گرفتار ہے۔ رات کو ہُو حق کے نعروں سے سارے محلے کے لیے وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ اُٹھتے دُعا۔ بیٹھتے دُعا۔ سوتے دُعا۔ جاگتے دُعا۔ آتے دُعا۔ بھاگتے دُعا۔ کھاتے دُعا۔ پیتے دُعا۔ مباشرت میں دعا۔ مجالست میں دعا۔ کوئی حملہ کر دے تو دُعا۔ مار مار کر بلپستر بگاڑ دے تو دُعا۔ یعنی نیچے دعا، اوپر دعا۔ اور عمل کے خانے میں صفر۔

اے دُعا خوانو! تم میں کتنے ایسے ہیں۔ جو اللہ کی راہ میں سر کٹانے کے لیے تیار ہیں؟ کتنے ایسے ہیں جو ملّت کی سربلندی کے لیے دس روپے بھی بخوشی دے سکتے ہیں؟ جو سچ بولتے اور سچے وعدے کرتے ہیں؟ کتنے ایسے ہیں، جو خدمتِ خلق کو اپنا فرض سمجھتے ہیں؟ کتنے ایسے ہیں، جو سودے پورے تولتے۔ جھوٹ سے بچتے اور جھوٹی شہادتوں سے اجتناب کرتے ہیں؟ کتنے ایسے ہیں، جن کے تابدار کردار۔ بلند اعمال۔ محنت اور اولوالعزمی پہ قوم ناز کر سکتی ہے؟ کتنے ایسے ہیں، جنھوں نے کلچر، تمدّن اور تہذیب

کی پیشرفت میں کوئی خدمت سرانجام دی ہو؟ کتنے ایسے ہیں، جن کے تھانوں پہ چست و چالاک گھوڑے نہایت ٹھاٹھ سے بندھے ہوئے ہیں؟ کتنے ایسے ہیں جن کی تلواروں کی بجلیاں دشمن کے کاشانے پر گرنے کے لیے بیتاب ہوں؟ کتنے ایسے ہیں، جو جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود کر اللہ سے ملنے کے لیے بے چین ہوں۔ کوئی نہیں۔ قطعاً کوئی نہیں۔ اور اگر ہے بھی تو یہ مشکل ہزار میں ایک۔ کیوں؟ اس لیے کہ ساری اُمت حدیث کو اسلام سمجھ بیٹھی ہے۔ وہ لَا اِلٰہ کے نشہ میں مست ہے۔ وہ خمارِ شفاعت میں مدہوش ہے۔ وہ چند دعاؤں کی بدولت جنّت کے لاکھوں محلّات کی مالک بنی بیٹھی ہے۔ اُس کا ہر وِرد لاکھوں حج کا ثواب دلاتا ہے۔ اُس کا ہر وظیفہ اُسے کروڑوں شہداء سے افضل بناتا ہے۔ خدارا بتاؤ کہ جس قوم کی دماغی کیفیت یہ ہو۔ جو اوہام میں سرتاپا ڈوبی ہوئی ہو جو دنیائے حقائق سے لاکھوں فرسنگ دور جا پڑی ہو۔ اُس کے پنپنے اور ترقی کرنے کی کیا صورت باقی رہ جاتی ہے۔

اِس بدحواسی اور اس کج دماغی کا علاج صرف ایک ہے۔ کہ وضعی احادیث کی تبلیغ بند کردی جائے۔ قرآن کو طاقِ نسیاں سے اُتار کر پھر قوم کے سامنے پیش کیا جائے ملّت کو پھر سطوت و جلال کا درس دیا جائے۔ اسے پھر تیر انداز و شمشیر باز بنایا جائے۔ اس کی عیش کوشیوں کو پھر سیلابوں کی تندی میں بدلا جائے۔ اس کے افسردہ و مُردہ اعضا میں پھر طوفانوں کا زور، اور دھاڑتی ہوئی لہروں کا شور پیدا کیا جائے۔

اور اس طرح اسے ایک ایسی مہیب طاقت بنا دیا جائے کہ اس کی ایک جنبش اقوام و ممالک کی تقدیریں بدل ڈالے۔ اور جب اس کے قشون تا ہر کسی سمت کا رخ کریں، تو خوف سے دھرتی کا سینہ دھڑکنے لگے۔ اور ہر طرف سے الامان والحذر کی صدائیں بلند ہوں ؎

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم!
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں (اقبالؒ)

اور یہ ہے قرآن کا اسلام!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

دو قرآن

"دو قرآن" کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ایک قرآن تو وہ ہے، جو حضور سرور کائنات صلعم کے سینۂ اقدس پر نازل ہؤا اور دوسرا قرآن صحیفۂ کائنات ہے۔ جس کے ایک ایک جزو کے مطالعہ کی طرف کلام الہی نے انسانوں کو توجہ دلائی ہے اور جو شخص زمین و آسمان، اختلاف لیل و نہار، معجزۂ تخلیق اور شجر و حجر اور حیوانات کے عظیم الشان تنوع کو علم کی روشنی میں نہیں دیکھتا، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا عرفان نہیں کر سکتا ہے۔

قابل مصنف نے قرآن مجید کی آیات بینات اور سائنس و دیگر علوم کی حیرت انگیز دریافتوں کو جمع کر کے ایسے ایسے حقائق کی طرف اشارات کیے ہیں کہ پڑھنے والے کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب مسلمانوں کو صحیح مسلمان بنانے کی اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام اور قرآن حکیم کے کمالات کو اجاگر کرے گی۔

"انقلاب" لاہور

قیمت چھ روپے